پوش مال
دیپک کنول

# پوش مال

## [Poosh Mal]

افسانوں کا مجموعہ

**دیپک کنول**

میزان پبلشرز

کتاب کا نام:۔ پوش مال
مصنف :۔ دیپک کنول
سن اشاعت:۔ 2017
کمپوزنگ :۔ جواہر پبلیکیشنز
ٹائٹل :۔ ایشور۔ ممبئ
پرنٹر :۔ میزان سروسز
پبلشر :۔ جواہر پبلکیشنز۔ ممبئ
ڈسٹری بیوٹر:۔ میزان پبلشرز سری نگر کشمیر 9419002212,8494002212
قیمت :۔ دوسو روپے

**Poosh Mal**

writer

Deepak Kanwal

Year of Edition 2017

Price:-200/Only

Publisher

**Jawahar Publications**

**16/4 Renaissance CHS Plot No:-9 Sector-8**

**Mhada-Malwani-Malad(W) Mumbai=400095**

Mail adress:-kanwaldeepak@ymail.com

Tel.No:-022-28804213-9322640792



(اس کتاب کے سبھی کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ وار نہیں ہوگا)

پبلشر

## در و بست

انتساب

اپنے بڑے بھائی طفیل اختر
اور بھائی گلزار جاوید
کی نذر جنہوں نے مجھے یہ سکھایا کہ سرحدیں ملکوں کو بانٹ سکتی ہیں دلوں کو نہیں۔

دیپک کنول
گمشدہ پتہ بڈگام (کشمیر)
تازہ پتہ ممبئی (مہاراشٹر)

## دیپک کنول کے نئے افسانوی مجموعے ''پوشہ مال'' کے خصوص میں ممتاز تخلیق کاروں کی آراء

☆ دیپک کنول موجودہ دور کے اُن ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے زندگی کی عمیق گہرائیوں میں اُتر کر زندگی کے مختلف پہلوں کو دیکھا محسوس کیا اور برتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں ایک احساس ہوتا ہے، اُسکا ردعمل ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی نزاکت ہوتی ہے اور ذہن وقلب کو متاثر کرنے کی قوت اور شدت ہوتی ہے۔ دیپک کنول کے قلم میں جہاں کشمیر کی مہک رچی بسی ہوتی ہے وہیں ہندوستان کی خوشبو قاری کو معطر کرتی ہے۔ میں آج کے اہم اور فعال افسانہ نگار دیپک کنول کو اُنکی ادبی کاوشوں کے لئے نیک خواہشات اور مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر کیول دھیر
لدھیانہ (پنجاب)

دیپک کنول کا شمار اُن قلم کاروں میں کیا جاتا ہے جو تقسیم کے درد کو محسوس بھی کرتے ہیں اور اُس کا مداوا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دیپک کنول کا تعلق کشمیر سے ہے اس لیے اُن کی کہانیوں کا موضوع اور محور اکثر کشمیر ہوا کرتا ہے۔ وہ سرحد کے دونوں طرف بسنے والوں کے دُکھ درد کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری کو جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کی تازہ کتاب ''پوش مال'' ایک طرح سے اُن کی قلبی کیفیت سے غماز ہے جس میں اُنہوں نے بہت سے نئے موضوعات بلکہ حساس موضوعات کو بھی بڑی دردمندی سے برتا اور قاری کو اپنے احساسات میں شریک کیا ہے۔ خاص طور سے ''کیپٹن کشور''، ''گھر واپسی''، ''جہلم کی واپسی''، ''پوش مال'' وغیرہ نے مجھے ذاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ میری دعا ہے کہ اُن کا قلم اسی طرح رواں دواں رہے اور ہم اُن کی کہانیوں سے آئندہ سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔

عذرا اصغر
کراچی (پاکستان)

اس سے قبل میں نے دیپک کنول صاحب کی کہانیاں کم کم پڑھی ہیں مگر جناب گلزار جاوید کی

آج کا افسانہ اپنے منظر نامے بیانئے اور موضوعات میں بہت پھیل چکا ہے۔ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں منزل و رستہ دونوں کھو چکے ہیں اور یہی اس عہد کے ادیب کا المیہ ہے۔ انکے کردار عموماً مسافر بس ڈرائیور اور کنڈکٹر ہیں۔ زندگی کے پیچ و خم میں گھومتی سڑکوں پہ رواں دواں۔ کشمیر کے پس منظر نے اُن کو مزید دلکشی دی ہے۔ یہ کردار اپنی منزل آشنا ہیں۔اپنی منزل سے جڑے ہیں مگر غالب نے کہا تھا کچھ اور وسعت چاہے میرے بیان کو۔ میری عاجزانہ رائے میں بیانئے پہ مزید توجہ سے ان افسانوں کی ہیت کو مزید بہتر کیا جاسکتا تھا۔ دیپک کنول کے افسانوں میں داستان کی رواں چاشنی تو موجود ہے مگر افسانوی سحر کشی مفقود ہے۔ بیانئے پہ توجہ و مطالعے کی مشقت انکے افسانوں کو مزید نکھار سکتی ہے

سیمیں کرن۔فیصل و آباد (پاکستان)

دیپک کنول کی کہانیوں میں انسانی ہمسری کا وصف بدرجہ اُتم پایا جاتا ہے۔ان میں اچھے اور برے ہر طرح کے کردار اپنی چھب دکھاتے ہیں۔ بیان کی چاشنی قاری کو آغاز سے انجام تک پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے لئے یہ سب سے بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔ میں دیپک کنول کو تازہ مجموعہ کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بھائی ظفر (ظفر اقبال)

ایڈیٹر روزنامہ زمستان۔سرگودھا (پاکستان)

ایک عرصہ قبل کسی نے کہا تھا کہ اگر آپ نے کشمیر نا دیکھا ہو تو دیپک کنول کے افسانوں کو مطالعہ کیجئے۔آپ کشمیر کے جغرافیہ اور حسین مناظر سے آشنا ہونگے۔ دیپک کنول کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد موصوف کی بات صد فیصد درست نظر آتی ہے۔یوں تو دیپک کنول اپنے لہجے کی دباذت، بیانیہ کی قوت اور ادراک و احساس کی شدت کی بنا پر اپنی نقش گری کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ ترقی پسندی سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دور تک آتے آتے ماضی قریب کے چند برسوں میں ان کے یہاں قاری کو جو چیز اپنی گرفت میں لیتی ہے وہ اُنکا انداز بیان ہے۔قاری انکی ساحرانہ گرفت سے باہر نکل نہیں پاتا ہے۔ دیپک کنول محض لکھنے کے لئے نہیں لکھتے ہیں بلکہ زندگی کے کھرے کھوٹے تجربے اور مشاہدے ان کے ذہن میں

رچ بس جاتے ہیں خصوصاً جہاں اُنہیں استحصال نظر آتا ہے اور اسی صورت میں اُنکا قلم رواں دواں ہو جاتا ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دیپک کنول اک حساس ذی ہوش افسانہ نگار ہیں جو اپنے کرداروں کو زندگی کے مختلف مسائل سے وابستہ رکھتے ہیں۔ یہی اُن کا وصف ہے۔

شجاع شاہد

(شاعر، کہانی کار) ممبئی۔

آپ کے افسانوں میں کشمیریت کے رنگ و بو مجھے مہکاتے اور سرشار کرتے رہتے ہیں۔ پوش مال کے مطالعے سے بھی خوب محظوظ ہوا ہوں۔

رفیق شاہین

کہانی کار۔ ترجمہ کار۔ علیگڈھ (یو۔ پی)

☆ برصغیر میں افسانے کے حوالے سے کئی اہم نام ایسے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیت اور فن پر دسترس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص جب کشمیر میں افسانے کے حوالے سے ذکر آتا ہے تو نور شاہ، دیپک بدکی اور دیپک کنول کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ میں دیپک جی کو ان کے نئے مجموعہ کلام کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کیلئے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

راغب شکیب (کراچی)

☆ دیپک کنول کی تحریروں کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جس میں زمین سے تعلق کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔ ان کے اس محاورے نے ہمیں خوش کر دیا۔ ''آگے آگرہ پیچھے لاہور''۔ ان کے افسانے ''زندگی او، زندگی'' کا کردار کرتار سنگھ، اس معاشرے کا زندہ کردار دکھائی دیتا ہے اور اس کی زبان سے افسانے کا ماحصل کہلوایا گیا کہ 'انسان کی عظمت کسی کی جان لینے میں نہیں، زندگی دینے میں ہے۔

نجیب عمر۔ کراچی (پاکستان)

☆ دیپک کنول کی چند کہانیاں میری نظر سے گزریں اور میں نے شائع کی ہیں۔ ان کہانیوں

کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ رائے دینے میں سہولت محسوس ہورہی ہے کہ دیپک کا مشاہدہ کمال کا ہے وہ فطرتِ انسانی کے کسی بھی پہلو سے ناآشنا نہیں، ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے کرداروں سے بڑی بڑی کہانیاں تخلیق کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور متوسط طبقے کے افراد کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں۔

شاہین زیدی

(مدیرہ سہ ماہی ''نوادر'' لاہور)

☆ دیپک کنول کا تعلق وادی کشمیر سے ہے۔ لیکن 1990 میں اُسوقت اس ریاست کے نامساعد سیاسی حالات سے مجبور ہو کر انہیں اپنی جنم بھومی کو چھوڑنا پڑا اور یہ ایک شدید درد لئے ہوئے وہاں سے ہجرت کر کے بمبئی (حال ممبئی) میں جا کر مقیم ہو گئے۔ حسن اتفاق سے وہاں فلم جگت کے عظیم اداکار دلیپ کمار سے اُنکی ملاقات ہوئی۔ انکی شخصی اور ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر دلیپ صاحب نے انہیں اپنے معاون کے طور پر رکھ لیا اور یہ اُن کی صحبت میں بارہ سال تک رہے۔ دیپک جی کشمیر سے اپنی ہجرت سے قبل ہی دو ناولٹ اور تین کامیاب ناول لکھ کر اُردو ادب میں اپنی شناخت جتلا چکے تھے۔ بعدازاں ممبئی میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھتے ہوئے چار افسانوی مجموعے ایک ناولٹ، ایک کتاب بچوں کے لئے تخلیق کرنے کے علاوہ ایک قابل قدر کتاب دلیپ صاحب پر بھی لکھی ہے جس میں انہوں نے نہایت بے باکی کے ساتھ ساتھ اپنے طویل ذاتی اور تاثراتی مشاہدے کی بنا پر دلیپ صاحب کی کثیر الجہت شخصیت کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کو پرائم ٹائم لاہور نے شائع کیا ہے۔ اسطرح سے اب تک ان کی بارہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن کی بھرپور پزیرائی کی گئی ہے اور انہیں کئی مقتدر ادبی اداروں کیطرف سے انعامات واعزازات سے نوازا بھی جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے متعدد ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹی وی چینلوں سے بھی انکی تحریروں کو اکثر نشر اور ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ مزید براں راولپنڈی (پاکستان) کے ایک معروف ماہ نامہ ''چہار سو'' میں بھی ایک مدت سے ان کا ایک نہایت مقبول کالم ''ایک صدی کا قصہ'' کے عنوان سے باقاعدگی سے شائع ہوتا آ رہا ہے جس میں یہ فلمی دنیا سے جڑے اداکاروں، موسیقاروں اور

دیگر فنکاروں کے بارے میں نہایت ہی دل چسپ اور بے حد معلوماتی حقائق سے قارئین کو روشناس کراتے ہیں۔ دیپک کنول صاحب ایک نہایت حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں اور ان کی بیشتر تخلیقات میں ناسٹیلجائی کیفیت کے تحت اپنی کشمیر وادی ہی سے متعلق ہیں جن میں ان کا بیانیہ اپنے قاری کو مسلسل اپنی مظبوط گرفت میں لئے رکھتا ہے۔ ان کے اظہار کی زبان نہایت ہی سلیس اور رواں ہے اور شستہ و شائستہ اور بے حد پر تاثیر بھی۔ دیپک جی اب اپنا نیا افسانوی مجموعہ ''پوش مال'' کے نام سے منظرعام پر لا رہے ہیں اور مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ان کی دیگر تصانیف کی طرح ان کے اس مجموعے کا بھی خاطر خواہ خیر مقدم کیا جائے گا اور ادبی حلقوں میں اس کی بھرپور پزیرائی کی جائے گی۔ دعا گوہوں کہ ان کا قلم آئندہ بھی اسی طرح رواں دواں رہے اور یہ اپنے چاہنے والوں کو اسی طرح اپنی نئی تخلیقات سے اُن کی قلبی اور روحانی غذا فراہم کرتے رہیں۔ آمین۔

مہندر پرتاپ چاند۔

انبالہ سٹی (ہریانہ)

☆ دیپک کنول کے بیان کا اندازِ بیان اُردو کے معروف کہانی کار سعادت حسن منٹو کی یاد دلاتا ہے مگر جس خاص بات کا ذکر مَیں کرنا چاہتا ہوں وہ کہانی کے کرداروں کے اوصاف میں وسعت نظری سے بیانیہ کا استعمال ہے اس کیلئے انہوں نے اپنی تحریر میں عوامی بیان کے ٹکڑوں سے کہانی کو بڑا امتمول کیا ہے وہ اپنے بیانیے میں جس طرح اُردو کی مسلمہ ضرب المثال یا محاورات کا استعمال بروئے کار لاتے ہیں اس سے کہانی کی روانی میں بانکپن آتا ہے اور اس کیساتھ ساتھ وہ عامتہ الناس کی بول چال کی زبان سے بھی حکمت بھرے محاورے چُن کرٹانکتے چلے گئے ہیں اور یہی امر اُن کی کہانی کو بڑھاوادیتا ہے اور کہانی کی تفہیم آسان ہوتی جاتی ہے۔ زیرِ نظر کہانیوں میں انہوں نے ایسے محاورے اور جملے برتے ہیں کہ کہانی تو الگ رہی اُس کی نثر بھی دلربا ہوگئی ہے مگر اس دلربائی میں کہانی کا بنیادی خیال بھی گم نہیں ہوا۔

مسعود تنہا

ایڈیٹر ''فکرِ نو'' لاہور (پاکستان)

☆ دیپک کنول سنجیدگی کے ساتھ افسانے لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ یہ ایک بڑی سچائی ہے کہ دیپک کنول نے اپنی دنیا خود بنائی ہے۔ اُنہوں نے کسی بیساکھی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا نہ کسی تحریک کے عملے میں بانہیں ڈالیں۔ وہ ممبئ میں ضرور رہتے ہیں لیکن اُن کے دل میں کشمیر کا دکھ و درد کروٹ لیتا رہتا ہے ۔ برف کے پہاڑوں سے اُٹھتے بارود کے دھوئیں کو دیپک کنول نے اکثر اپنے افسانوں کا محور بنایا ہے۔ ''اسباق'' میں اکثر اُنکے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے سادہ اسلوب اور زندگی سے قریب مواد ومتن کی بنا پر ایک کامیاب افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ دیپک کنول کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا تو اسے سراہا جائے گا۔ افسانہ ہو کہانی ہو وہیں پسند خاطر ہوتا ہے جس میں انسان کے اپنے دل کا درد نظر آتا ہے ۔ دیپک کنول کے افسانے انسانی درد و کرب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہے

نذیر فتح پوری

مدیر ماہنامہ ''اسباق'' پونے۔ (مہاراشٹر)

دیپک کنول کے افسانے ایک عرصہ سے پڑھنے کو مل رہے ہیں وہ ہر بار ایک نیا موضوع لے کر سامنے آتے ہیں اور نئے انداز سے حیران کر جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جہاں دیہاتی ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے وہیں پر شہر کی بود و باش رکھنے والے رنگارنگ قسم کے کردار بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کو اس قدر حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہر فرد کو اس میں آئینہ نظر آتا ہے۔ دیپک کنول کے افسانوں میں اُردو زبان کی چاشنی بھی موجود ہے اور ہندی بھاشا کی نرملتا اور کوملتا بھی جھلکتی ہے اس لیے وہ جب اپنے کسی کردار کا مکالمہ تحریر کرتے ہیں تو اس میں زبان و بیان کی مدھرتا کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مکالموں کے ذریعے نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ اپنے عہد کو اگلی نسل تک منتقل کرتے ہیں۔ قبل ازیں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''لال پُل کا دیوانہ'' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے اور اب نیا مجموعہ ''پوش مال'' بھی اپنے اندار ہر رنگ اور ہر خوشبو کا افسانہ لیے موجود ہے۔ ان کے افسانوں کی یہ مالا بھی ان کے سابقہ افسانوں کی طرح بہت گہرائی اور تہہ داری میں لپٹے ہوئے افسانوں پر مشتمل ہے۔ خاص طور پر ان کے افسانے منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

دیپک کنول اپنے موضوعات کا انتخاب کڑے مشاہدے اور طویل تجربے کی بنا پر کرتے ہیں ۔لہٰذا وہ اُن واقعات کو بھی سامنے لاتے ہیں جو بظاہر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پہلی قرأت میں یہ بتا دیتے ہیں کہ اُنہیں دیپک کنول کے قلم نے تحریر کیا ہے۔میں انہیں ان کے نئے افسانوی مجموعے''پوش مال'' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آفتاب خان

شاعر،فلم رائٹر لاہور(پاکستان)

دیپک کنول کے چند افسانے میری نظر سے گزرے ہیں مجھے ان کے افسانوں میں انسانی ہمدردی کا پہلو بدرجہ اُتم نظر آیا ہے،ان کا اسلوب بیانیہ اور سادہ مگر دلنشیں ہے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔میں انہیں نئے افسانوی مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارکباد کے ساتھ ساتھ ان کے تابناک مستقبل کیلئے دعا بھی کرتا ہوں۔

افتخار مجاز

سنئیر پروڈیوسر پی ٹی وی،لاہور(پاکستان)

بین الملکی ادبی سرمایے میں ریاست جموں وکشمیر کے قلمکار بھی ابتدا سے ہی توسیع کا فریضہ انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔تحقیق تنقید،شاعری،صحافت اور افسانہ نگاری کے فن میں وادی کشمیر کے فن کاروں نے بھی دنیا میں کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔افسانہ نگاری کے میدان میں ظفریابی کا پرچم لہرانے اور ایک عالم کو مطیع بنانے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی آج بھی یہاں کے جو افسانہ نگار جلوہ گہہ آفاق پر تاباں اور درخشاں نظر آتے ہیں اُن کی فہرست خاصی طول وطویل ہے اور بطور مثال نور شاہ،ویریندر پٹواری،حامدی کشمیری،دیپک بدکی،وحشی سعید،حسن ساہو اور دیپک کنول کے نام ہی شمار کرادینا کافی ہوگا۔دیپک کنول اگرچہ کشمیر سے ہجرت کر کے ڈیڑھ دہے سے مہاراشٹر کے شہر عروس البلاد ممبئی کو اپنا وطن بنا چکے ہیں لیکن سیمنٹ کنکریٹ اور فولاد سے بنے اس شہر نما جنگل میں اُن کا دم گھٹتا ہے اور ہمہ وقت پھولوں کی شہزادی کشمیر کی وادی کے سرسبز پہاڑ،نیلی جھیلیں،بل کھاتی ندیاں،شفاف چشمے،دیودار اور صنوبر کے خنک سایے،ہوا

میں سرسراتی چنار کی شاخیں، گنگناتے آبشار اور سروں کو چومتے بادلوں کے تاج اُن کی نگاہوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے وطنی، ہجرت اور اپنوں سے بچھڑنے کا غم اُن کے افسانوں کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے۔ اُن کے کشمیری ماحول اور کشمیری کرداروں کے دکھ ودرد سے بنت کئے افسانے ایک ایسے پل کا درجہ رکھتے ہیں جو درمیان میں حائل فاصلے کے باوجود آج بھی اُنہیں اُن کے آبائی وطن سے جوڑکر رکھے ہوئے ہے۔ دیپک کنول کے افسانے ہندوپاک میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مقبول ہیں۔ دلیپ کمار پر اُنکی کتاب کے کئی ایڈیشن پاکستان میں ہی شائع ہوئے تھے۔ پاکستان کے ادب لطیف، تخلیق، چہارسو، بادبان، فنون اور دوسرے معیاری رسائل میں اُنکے افسانے تزک واحتشام سے شائع ہوتے ہیں اور کوئی مکتوب ایسا نہیں ہوتا جس میں اُن کے افسانوں کی تعریف وتوصیف نہ کی گئی ہو۔

رئیس الدین رئیس

علی گڑھ۔ (اُتر پردیش)

1990 کے بعد وادی کشمیر میں سیاسی ماحول کی وجہ سے مقامی ادیب بھی سیاسی اور نظریاتی طور پر تقسیم ہو چکے ہیں اور اپنے اپنے موقف کی عینک سے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تحریروں میں حقیقت بیانی کی جگہ کہیں کہیں منافرت اور عداوت جھلکتی ہے۔ ایسے حالات میں جو سچ کو سچ لکھتے ہیں۔ پیار، ستکار بھائی چارے اور مفاہمت کا درس دیتے ہیں، اُن میں دیپک کنول سرفہرست ہیں اردو دنیا میں اور خصوصاً جموں وکشمیر کی اُردو افسانہ نگاری میں دیپک کنول ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانے مثبت فکر ونظر کے حامل ہیں۔ اسی لئے اثر انگیز ہیں۔ کشمیر اور کشمیریت کے پس منظر میں لکھے اُن کے بیشتر افسانے قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ منتخب موضوعات کی خوبصورت پیش کاری، زبان وبیان کی شگفتگی اور فنکارانہ چابک دستی اُنکی کہانیوں کا وصف ہے۔ اُنکی کہانیاں قاری کو منفی سوچ، ذہنی انتشار اور دیگر نفسیاتی کیفیتوں سے باہر نکالتی ہیں اور بداعتمادی کی خلیج کو بھرنے کا کام کرتی ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کے ایک اچھے شہسوار ہیں۔ اُن کا اسلوب منفرد ہے۔ وہ اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اُنکے افسانوں میں زندگی کا

تجربہ ملتا ہے۔عوامی مسائل کی عکاسی ملتی ہے، انسان دوستی کا جذبہ ملتا ہے۔اُن کے افسانوں میں رومانیت کی جگہ کشمیری معاشرے میں پھیلی سیاسی بے چینی اور کڑواہٹ کی زمینی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔دیپک کنول کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ افسانہ لکھتے وقت جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اپنے فن پارے کو حقیقت نگاری سے یوں پیش کرتے ہیں کہ قاری اس میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔اُن کے افسانے انسانی اقدار محبت رواداری اور تخلیقی بالیدگی کا حساس دلاتے ہیں۔اُنکے افسانے اپنی مٹی کی خمیر میں گوندھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے مجھے بہت پسند ہیں کیونکہ ان افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت ایک مظبوط اکائی بن کر اُبھرتی ہے۔

خالد حسین

پنجابی، اُردو افسانہ نگار ( بٹھنڈی )۔جموں

☆ گزشتہ نصف صدی سے ریاست جموں وکشمیر کے اُردو فکشن کی ثروت میں دیپک کنول نے جو گراں قدر اضافہ کیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے افسانوں میں نہ صرف قدیم تہذیب وتمدن، فکر ونظر اور آپسی میل ملاپ کے اشارے اور نمونے ملتے ہیں بلکہ موجودہ دور کی اصلیت، حقیقی رنگ حالات وواقعات، سماجی بہاو اور نئی اور جدید تبدیلیوں کے سوالات، زہر کی صورت میں اُبھر آتے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر کے منظر میں لکھے گئے ان کے اکثر افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُن کے اکثر کردار کشمیر، کشمیری اور کشمیریت کا احساس لئے نظروں کے سامنے آتے ہیں اور زندگی کے درد وکرب، سیاسی اُلٹ پلٹ، انگنت سماجی اخلاقی اور مالی مسائل ومشکلاتکو سادگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کی شخصیت کی دوسری خوبیوں میں اُن کی شرافت، اُن کے لہجے کی سنجیدگی، اپنوں اور غیروں سے یکساں طور احترام کا جذبہ اور تخلیقی فعالیت میں گراں قدر اضافہ شامل ہیں۔

نور شاہ

سری نگر ( کشمیر )

☆ دیپک کنول کو میں اُس زمانے سے جانتا ہوں جب ''نگینہ'' پہلی بار منظر عام پر آیا تھا اور جب تک ''نگینہ'' شائع ہوتا رہا وہ اسکی اشاعت اور فروغ کے لئے ہمیشہ صف اول میں نظر آتے تھے۔

دراصل اُن کے اندر جو کہانی کار پوشیدہ تھا وہ ''نگینہ'' کی وساطت سے ہی معرض وجود میں آیا۔ پھر ''نگینہ'' کی اشاعت گردش زمانہ کی وجہ سے بند ہوگئی۔ دیپک کنول قبل از وقت سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر بمبئی چلے گئے۔ میں بھی کچھ عرصے کے لئے ادبی زندگی سے دور ہوتا گیا۔ دیپک کنول سے ملاقاتیں کم ہوتی گئیں لیکن جب بھی اور کہیں بھی ملنے کا اتفاق ہوتا میں نے ہمیشہ اُن میں دوستی کا جذبہ پایا۔ پھر 2013 میں ''نگینہ'' ایک بار پھر پورے اہتمام اور ایک نئے رنگ وروپ کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ دیپک کنول ''نگینہ'' کے لئے پھر سے لکھنے لگے۔ ان کے افسانوی تخلیقات ''نگینہ'' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اب بھی ممبئی میں قیام پزیر ہیں لیکن جب بھی کشمیر آنا ہوتا ہے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ دیپک کنول نے اپنی افسانوی تخلیقات کی بدولت اپنی ایک پہچان بنالی ہے اور وہ افسانوں اور افسانوی کرداروں میں حقیقی رنگ بھرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو کشمیری رنگ نظر آتا ہے وہ اُن کی اپنی جنم بھومی سے محبت کی ٹھوس بنیاد ہے۔

وحشی سعید

مدیر اعلیٰ ''نگینہ'' سری نگر (کشمیر)

☆ دیپک کنول کے افسانے اضطرار اور اضطراب سے عبارت ہیں۔ ان کو کردار نگاری پر قابو ہے۔ وہ اجمالی اختصار سے بھی واقف ہیں۔ اچھی اُردو لکھنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

جموں کشمیر کے اُردو مصنفوں

۲۰۰۴ سے ایک اقتباس۔

(مصنف جان محمد آزاد)

# کپٹین کشور

اصل نام علی کمال۔ باپ کا نام جمال الدین، پرانا پتہ محلّہ حبہ کدل سرینگر پیشہ کلینز۔

نیا نام کپٹن کشور، باپ کا نام جمال الدین نیا پتہ بشمبر نگر منوار سری نگر پیشہ ڈرائیور۔

جس دن علی کمال کی ڈیوٹی لال سنگھ ڈرائیور کے ساتھ لگادی گئی علی کمال کچھ نہیں بولا۔ وہ چپ چاپ اپنے اُستاد کی ٹرک کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ لال سنگھ ادھیڑ عمر کا ایک سکھ تھا جو جموں کا تھا ہمیشہ ژولیدہ منہ لئے گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُسکی پگڑی کہاں ہے۔ وردی کہاں ہے اُسے کوئی سدھ ہی نہیں ہوتی تھی۔ اُسنے جب علی کمال کے سراپا کا جائزہ لیا تو وہ جھلا کر دوڑتے ہوئے یارڑ ماسٹر کے پاس گیا اور اُسے ایک کونے میں لے جاکر کہا۔

''جناب یہ کیڈے چھوکرے کو آپ نے میرے نال لگا دیا۔ یہ تو بابو بنا پھرتا ہے۔ یہ کیا کلنڈری کرے گا۔۔ او جناب اس کا پہناوا دیکھو۔ مینوتو یہ کسی بھی زاویے سے کلینڈر نہیں لگدا ہے؟''

علی کمال کی بھرتی اس محکمے میں چھ مہینے پہلے ہوئی تھی۔ جو پہلا والا یارڑ ماسٹر تھا اُسنے اُسے حرز جان بنا کے رکھا تھا اس لئے اُسے کسی ٹرک کے ساتھ کام کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ علی کمال کا باپ جو کہ پیشے سے ڈرائیور تھا ایک منسٹر کی گاڑی چلاتا تھا۔ دو سال قبل اُسکی حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے موت ہوئی۔ منسٹر نے اپنے مرحوم ڈرائیور کی وفاداری کے عوض اُسکے بیٹے کو نوکری پر لگا دیا تھا۔ پرانا یارڑ ماسٹر اُسکے باپ کا زیر بار تھا کیونکہ اُسنے ایک بار اُسے رشوت ستانی کے الزم میں پکڑے جانے پر نہ صرف اُسے جیل جانے سے بچالیا تھا بلکہ اُسکی معطلی بھی رکوائی تھی۔ اس احسان کو وہ بھول نہیں پایا تھا اسلئے وہ علی کمال کو اپنے بچے کی طرح سمجھتا تھا۔ اُسکی ایک ہفتے پہلے تبدیلی ہوئی تھی اور اسکی جگہ نیا یارڑ ماسٹر آیا تھا جو بڑا کڑک اور بے مروت افسر تھا۔ اس محکمے میں حرام خوروں کی تعداد کافی تھی جو مہینے بھر نابود رہتے تھے لیکن پہلی تاریخ کو کسی خودرو جھاڑی کی طرح نمودار ہوجاتے تھے اور یارڑ ماسٹر کی منہ بھرائی کر کے پورے مہینے کی تنخواہ لے کے نکل جاتے تھے۔ نئے افسر کے آتے ہی ان حرام خوروں کی بن آئی تھی۔ ان سب کو کام

پر لگا دیا گیا تھا۔ ان میں ایک علی کمال بھی تھا۔ اُسنے علی کمال کی ڈیوٹی بدرو لال سنگھ کے ساتھ لگا دی۔ لال سنگھ اول درجے کا اودباش تھا۔ ایک نمبر کا مے خوار، دوم اُسے ادھر اُدھر منہ مارنے کی لت لگ گئی تھی۔ گھر میں ایک خوبصورت بیوی اپنے سہاگ کی سلامتی کی ہر دم دعائیں مانگا کرتی تھیں اور وہ اتنا کمینہ اور کم ظرف تھا کہ گھر سے باہر جاتے ہی وہ اللّے تللّے کرنے لگتا تھا۔ دلی پہونچتے ہی وہ شب باشی کے لئے کوٹھوں پر جایا کرتا تھا۔ رنڈی چاہے سڑی بسی ہی کیوں نہ ہو اُسے اُس کی شکل وصورت سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو بس اپنی بھوک مٹا کر نکل جاتا تھا۔ اصل میں کچھ لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گھر کا شدھ کھانا کھاتے کھاتے اتنے اوب جاتے ہیں کہ باہر کو جو بھی روکھا سوکھا تیکھا، باسی ملے وہ چٹخارے لے کر کھاتے ہیں۔ لال سنگھ بھی اُن ہی لوگوں میں سے ایک تھا جو گھر کی مرغی کو دال برابر سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے کلینزا اپنے ساتھ رکھتا تھا جو ہونق ہوں۔ جن کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ جو ایک دم اللہ میاں کی گائے کی طرح ہوں۔ جو ہمیشہ اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہیں۔ علی کمال تو لال سنگھ کو بڑا تیز وطرار لگا۔ اُسے لگا کہ یہ اُسکے تابع میں نہیں رہے گا اور اُسکی کرتوتوں کی ڈانڈی بجاتا پھرے گا۔ اپنی ساکھ وسلامتی کو خطرے میں پا کر لال سنگھ نے یارڈ ماسٹر کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ کسی اور کلینز کو اُسکے ساتھ لگا دے مگر علی کمال کو نہیں۔ علی کمال مست مولا آدمی تھا۔ اُسے یہ غرض نہیں تھی کہ کون کیسا ہے۔ وہ تو بس یہاں وقت گزاری کے لئے آیا تھا۔ اُسے محکمے کی طرف سے وردی ملی تھی جو اُسنے تہہ کر کے گھر میں رکھ دی تھی۔ اسنے اس وردی کو ایک دن بھی نہیں پہنا تھا۔ اُسے یہ نیلے رنگ کی وردی آگ بجھانے والے کارندوں کی سی جیسی لگتی تھی جسے پہننے میں وہ شرم محسوس کرتا تھا۔ اُسے اچھا پہناوے کا بڑا شوق تھا۔ وہ بل باٹم کی پتلون اور رنگ دار قمیضیں پہننے کا شوقین تھا۔ وہ ہمیشہ بڑے ٹھاٹ بھاٹ سے رہتا تھا۔ بے کار ہونے کے باوجود وہ استری کی ہوئی رنگین قمیضیں اور کالا چشمہ پہن کے جب گھر سے نکلتا تھا تو کسی ہیرو سے کم نہیں لگتا تھا۔ اصل میں وہ فلمیں دیکھنے کا بڑا شوقین تھا۔ متھن چکرورتی اُسکا پسندیدہ ہیرو تھا۔ وہ اپنے ہیرو کی طرح ہی رنگ برنگی شرٹس پہنتا تھا۔ اُسکی طرح چلتا تھا۔ اُسکی طرح بولتا تھا۔ جب وہ کلینز بھرتی ہوا تو اُسکے رنگ ڈھنگ میں رتی بھر بھی بدلاو نہیں آیا۔ وہ اپنی ذات برادری کے لوگوں سے قدرے مختلف تھا۔ جب وہ دوسرے کلینزوں کو دیکھتا تھا تو اُسے اُن پر دیا آتی تھی۔

پچکے ہوئے گال، ویران اور بے نور آنکھیں، جیسے کوئی بنجر کھیت، کھر درے ہاتھ پیر۔ تیل اور موبئل لگے ہاتھ۔ ملگجی وردی۔ بکھرے ہوئے بال۔ وہ ان جیسا بننا نہیں چاہتا تھا اس لئے وہ اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔

لال سنگھ کی عاجزی کے باوجود نیا یارڑ ماسٹر ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسنے تحکمانہ انداز میں لال سنگھ سے کہا۔ ''کلینز نہیں بدلے گا۔ علی کمال ہی تمہارے ساتھ رہے گا''

لال سنگھ نے طوعاً و کرہاً علی کمال کو اپنے ساتھ رکھا۔ علی کمال نام کے لئے کلینز تھا۔ لال سنگھ کو سارے کام خود ہی کرنے پڑتے تھے۔ ایک دن جل کر اُسنے علی کمال سے کہا۔

''اوئے تو تو غلط محکمے میں بھرتی ہوا ہے۔ تینوں کسی فلم کمپنی میں بھرتی ہونا چاہے تھا۔ جا چھڑ دے یہ کام اور بمبئی چلا جا۔ ہیرو نہ بنے تو کوئی گل نہیں۔ کسی ہیرو دا اردلی بن جا۔ ڈرائیور بن جا۔ اے کام توڑے بس دا نہیں ہے۔ لوگ تینوں میرے نال دیکھتے ہیں تو اُنہیں لگدا ہے کہ میرے نال کوئی بابو بیٹھا ہوا ہے۔''

علی کمال چپ چاپ لال سنگھ کی ڈانٹ سنتا تھا۔ ایک دن لال سنگھ نے زچ ہو کے اُسے نیا نام دیا۔ کپتین کشور۔ برادری کا کوئی سردار ڈرائیور پوچھتا۔

''یہ تیرے نال کون ہے پراجی؟'' تو جواب میں وہ کہتا۔

''کپتین کشور''

اس محکمے کی یہ خاصیت تھی کہ یہاں ملازم ہونے کے بعد ہر کلینز ڈرائیور کو کوئی نہ کوئی نیا نام مل جاتا تھا۔ اصل نام سے چند دبنگ ہی جانے جاتے تھے، باقی جتنے بھی تھے اُنکے نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی لاحقہ لگا رہتا تھا۔ جیسے علی محمد بہت چائے پیتا تھا تو اُسکا نام علی چائے پڑ گیا۔ ایک کلینز کو نمونیا ہو گیا تو اُسکا نام ہی نمونیا پڑ گیا۔ اب علی کمال کپتین کشور کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسکا یہ نیا نام محکمے میں چند ہفتوں میں ہی وبا کی طرح پھیل گیا۔ اپنی برادری کے کلینز جب اُسے چڑانے کی غرض سے کپتین کشور کہہ کے بلانے لگتے تھے تو غصہ کرنے کی بجائے وہ مسکرانے لگتا تھا۔ اپنے اُستاد سے یہ لقب پا کر وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ بڑے دنوں بعد کسی نے اُسکی شخصیت کو پہچان لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر ایک مسرت آمیز

احساس سے شرابور ہو جاتا تھا کہ متھن چکرورتی نہ سہی کم سے کم اُسکی فلم کے ٹائٹل کپٹین کشور کہہ کے لوگوں نے اُسے بلانا تو شروع کیا۔ اسے وہ ہتک نہیں بلکہ اعزاز سمجھتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس نام سے اتنا مانوس ہو گیا کہ اگر اُسے کوئی اصلی نام سے بلاتا تھا تو وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔

تھوڑا سا ہاتھ صاف ہوتے ہی اُسنے اس نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ اس نوکری میں اپنے آپ کو محبوس اور اسیر سمجھتا تھا۔ یار دوستوں نے اُسے بہتیرا سمجھایا کہ ایسی حماقت نہ کر۔ یہ نوکری تقدیر سے ہی ملتی ہے مگر وہ تو جیسے طے کر کے بیٹھا تھا اسلئے اُسنے کسی کی ایک نہ سنی اور ایک دن وہ نوکری چھوڑ کے چلا گیا۔ لال سنگھ جو اسے قطعی پسند نہیں کرتا تھا اُسنے اُسے سمجھایا مگر اُسنے اُستاد کی بھی نہیں سنی۔ ایک دن وہ اس بندھن سے آزاد ہوا۔

اُسکا باپ تھا نہ بھائی بہن تھی نہ بیوی۔ بس ایک ماں تھی جو اُسکے لئے کل کائنات تھی۔ وہ اپنی ماں کی ایک طرح سے پوجا کرتا تھا۔ اُسکی ایک خوشی کے لئے وہ ہزار جانیں قربان کرسکتا تھا۔ اُسکی ماں بھی اُسے اپنا کل اثاثہ سمجھ رہی تھی۔ اُسکی دنیا گھوم پھر کے اُسی پہ آ کے رک جاتی تھی۔ وہ اپنے بچے کو بس ہر دم ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسکی ایک مسکراہٹ اُسکی زندگی کو اُجالوں سے بھر دیتی تھی۔ جب اُسنے نوکری کو خیر باد کہہ دیا تو ماں نے اُس سے پوچھا۔

"بیٹا اچھی خاصی نوکری کو تم نے لات کیوں ماردی؟"

"تیرے لئے تو میں جنت بھی ٹھکرادوں ماں۔ میں ہفتے ہفتے گھر سے باہر رہتا تھا تو تمہیں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ بس یہی سوچ کر میں نے نوکری چھوڑ دی"

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں ٹیکسی چلالوں گا۔ پنچھی کی طرح میں دن بھر کہیں بھی اُڑتا پھروں، رات کو اپنے آشیانے میں لوٹ آوں گا۔"

بیٹے کا پیار دیکھ کر ماں کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں بولی۔

"تم جس کام میں خوش رہو گے وہی کرلینا۔ میری خاطر اپنا کل برباد مت کرنا"

''اماں، میرا آج بھی تم ہو، کل بھی تم ہو۔ میں تبھی خوش رہوں گا جب تم خوش رہوگی۔'' تھوڑے توقف کے بعد اُس نے جھکتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''اماں اگر میں یہ مکان بیچ دوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟''

''کیسی بات کرتے ہو میرے بچے۔ اگر اس مکان کے بیچنے سے تمہارا بھلا ہوگا تو مجھے برا کیوں لگے گا۔ پر ایک بات تو بتاو، تم اس مکان کو کیوں بیچنا چاہتے ہو؟''

''اماں ٹیکسی خریدنے کے لئے ایک بڑی رقم درکار ہوگی۔ ایک بار ٹیکسی ہاتھ میں آگئی پھر میں تمہیں اس سے بھی بڑا مکان خرید کر دوں گا۔''

''مجھے مکان سے پہلے ایک بہو چاہیے۔ مرنے سے پہلے میں تمہارے پوتے پوتیوں کا منہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ شرما گیا۔ آنکھیں چراتے ہوئے بولا۔

''ایسی بہولا کے دوں گا اماں جو کسی حور سے کم نہیں ہوگی۔ ایک بار مجھے ٹیکسی تو لینے دو۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک دن اُسنے اپنے آبائی مکان بیچ ڈالا اور اپنی ماں کے ساتھ بشمبر نگر میں جا کر ایک کرایے کے مکان میں رہنے لگا۔ اُسکے بعد اُسنے مکان کے پیسے سے ایک ایمبیسڈر ٹیکسی خرید لی اور جب وہ ٹیکسی شوروم سے نکال کر اپنے گھر لے آیا تو وہ اتنا شاداں وفرحاں تھا کہ اُسنے اپنی ماں کو گود میں اُٹھا کر اُسے بچے کی طرح چند لمحے گھمایا۔ اماں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ پاگلوں کی طرح بس ہنستا رہا۔ اسکے بعد وہ اپنی ماں کو ٹیکسی میں بٹھا کر دستگیر صاحب کے آستانے پر لے گیا۔ ماں نے وہاں جا کر اپنے بچے کی خوشحالی کی دعا کی اور پھر اُسکی شادی کے لئے منت کا دھاگہ باندھ لیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ اُسے تینوں مغل گارڈن گھما کے لایا۔ پھر علی جو کے ڈھابے میں بٹھا کر اُسے گرم گرم پراٹھے اور حلوہ کھلا دیا اور ساتھ میں چائے پلا دی۔ ماں اُس پر ہزار جان سے واری صدقے ہوئے جا رہی تھی۔

کپتین کشور نے اپنی ٹیکسی کو دلہن کی طرح سجالیا۔ وہ خود جیسا خوش لباس تھا ویسے ہی اُسنے اپنی ٹیکسی کو بھی رنگین سیٹ کوروں سے آراستہ کیا تھا۔ وہ اپنی ٹیکسی ایرپورٹ پر کھڑی کرتا تھا۔ تھوڑی بہت

انگریزی اُسے آتی تھی اسلئے وہ زیادہ تر بدیشی سیاحوں کو اپنی ٹیکسی میں بٹھالیتا تھا۔ اُسکی خوش خلقی اور نفاست کو دیکھ کر زیادہ تر بدیشی ٹورسٹ اُسکی ٹیکسی میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ان سبھی اوصاف کے باوجود اُسکی قسمت بھی اُسکا ساتھ دے رہی تھی۔

ایک دن جب اُسکی ٹیکسی کا نمبر آیا تو اُسکے حصے میں ایک آسٹریلین ٹورسٹ مرینا آ گئی۔ مرینا بلا کی خوبصورت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے اسے مکھن سے بنایا ہو۔ اُسکا گول مٹول چہرہ، اُسکی گہری نیلی جھیل جیسی آنکھیں، اُسکے گھنگریالے بال، اُسکا چوڑا ماتھا، موتی جیسے دانت، گلاب کی پنکھڑی جیسے اُسکے ہونٹ۔ وہ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ کپٹین کشور پہلی نظر میں ہی اُس پر ہزار جان سے قربان ہو گیا۔ اپنے آپ کو اس طلسم کے جال سے نکال کر اُسنے بمشکل تمام اُس سے انگریزی میں پوچھا۔

''کہاں چلو میم صاحب؟''

''براڈوے ہوٹل''

اتنا کہہ کر اُسنے اپنے پرس سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پھر ایک سگریٹ سلگا کر وہ دائیں بائیں کے نظاروں میں کھو گئی۔

کپٹین کشور نے اُسے براڈوے ہوٹل میں چھوڑا۔ جب اُسکا سامان ہوٹل کے بوائے نے اُتارا تو اچانک وہ چلتے چلتے رک گئی اور اُس نے کپٹین سے کہا۔

''کل صبح آٹھ بجے ٹیکسی لے کے آجانا۔ ہم کو گلمرگ چلنا ہے''

کپٹین کشور نے ایک رابرٹ کی طرح سر ہلایا۔ وہ تب تک بت بنا وہیں پر کھڑا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اچانک وہ ہارن کی آواز سے ہڑبڑایا۔ اُسکے پیچھے ایک اور ٹیکسی آ کے کھڑی ہوئی تھی جس کا راستہ اُسکی ٹیکسی نے روکا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیکسی لے کے گھر کی اور نکل گیا۔

اُس رات مرینا اُسکے دل و دماغ پر رات بھر چھائی رہی۔ وہ رات اُسنے اُسکے تصور کے ساتھ گزاری۔ وہ بس صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ کب صبح ہو جائے اور وہ اُسے دوبارہ نظر بھر کے دیکھے اور اُسکی

تصویر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں بسا کے رکھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے پانا دیوانے کے خواب جیسا ہے جو کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو بس اُسکے دیدار کر کے اپنی آنکھوں کو سینکنا چاہتا تھا۔

صبح ہوئی تو وہ جھٹ پٹ تیار ہو گیا۔ اُسنے ایک نئی قمیض اور پتلون پہنی اور بدن پر قیمتی پرفیوم چھڑکا اور پھر آنکھوں پر کالا چشمہ ڈالے وہ ماں سے رخصت لے کر براڈوے کی طرف گاڑی دوڑانے لگا۔ جب گاڑی گیٹ پر پہونچی تو وہ نیلے رنگ کی جیکٹ ڈالے اور سر پر فر کی ٹوپی پہنے لابی میں پہلے سے تیار بیٹھی تھی، جونہی اُسے اطلاع کر دی گئی کہ ٹیکسی لانج میں کھڑی ہے تو وہ اپنا پرس جھلاتے ہوئے باہر آ گئی۔ جونہی کپٹین کشور نے اُسے دیکھا تو اُسکا دل بلیوں اُچھل پڑا۔ وہ جھٹ سے گاڑی کا دروازہ کھول کے کھڑا ہو گیا۔ وہ جونہی قریب آ گئی تو کپٹین کشور نے اُسے گڈ مارننگ کہا۔ جواب میں اُسنے بھی گڈ مارننگ کہا اور پھر وہ تھینک یو بول کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی سبک رفتاری کے ساتھ گلمرگ کی اور بڑھنے لگی۔ چند لمحے گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ کپٹین کشور مرینا سے بات کرنے کے لئے بے تاب تھا مگر اُسکی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کہاں سے شروع کرے۔ یہ سکوت مرینا نے توڑا۔ اُسنے کپٹین سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کپٹین کشور'' اُسنے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ مرینا نام سن کے زرا سی چونکی پھر چند ثانیے کے بعد اُس سے پوچھنے لگی۔

''کیا تم فوج میں تھے؟''

''نہیں۔ اصل میں یہ نام دوستوں کا دیا ہوا ہے۔ مجھے بھی نام اچھا لگا اسلئے میں نے اس نام کو سر ماتھے سے لگا لیا۔ میم صاحب آپ کو یہ نام پسند آ گیا کیا؟''

''پیارا نام ہے۔'' مرینا نے مسکرا کے کہا۔ برف پگھل چکی تھی۔ ایک بار برف جو پگھلتی ہے تو پھر پانی پھوئیاں پھوئیاں رستا رہتا ہے۔ گلمرگ تک وہ بس باتیں کرتے رہے۔ مرینا کو پتا ہی نہیں چلا کہ اتنا لمبا سفر کیسے کٹ گیا۔ کپٹین کشور اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ وہ اُسے پورے گلمرگ میں گھمانے لگا۔ اُسنے

اُسے ٹٹو پر بھی بٹھا دیا۔ گھڑبان کی جگہ وہ خود گھوڑے کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ جہاں گھوڑا تھوڑی رفتار پکڑنے لگتا تھا اور مرینا اپنا توازن کھونے لگتی تھی تو وہ لپک کر اُسے سہارا دیتا تھا۔ اُسکا کومل سا بدن جب اُسکی بانہوں میں جھولنے لگتا تھا تو اُسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہوا کے دوش پہ اُڑ رہا ہو۔

اگلے روز وہ اُسے پہلگام لے کے گیا۔ دن کے دو بجے جب اُسے بھوک لگی تو اُسنے اپنا ٹفن گاڑی سے نکالا اور ایک پیڑ کے نیچے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ابھی اُس نے ایک نوالہ بھی اپنے منہ میں نہیں ڈالا تھا کہ مرینا پیچھے سے نکل آئی اور اُسکے کھانے پر لپک کر اُس سے بولی۔

''یہ تمہارے گھر کا کھانا ہے نا۔ تمہاری بیوی نے پکایا ہوگا۔''

''نہیں میم صاحب میں ابھی تک کنوارا ہوں۔ یہ کھانا میری ماں نے پکایا ہے۔''

مرینا نے جب پلیٹ پکڑ کر کھانا چکھا تو اُسے کھانا اتنا لذیذ لگا کہ وہ سارا کھانا اکیلے ہی چٹ کر گئی۔ وہ کھانے میں مصروف تھی جب کہ کپٹین کشور اُسے وارفتگی سے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اُسنے اُسکی ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کپٹین کشور بلیوں اُچھل پڑا۔ اُسنے مرینا سے کہا کہ وہ شام کو اُسے ماں سے ملوانے اپنے گھر پر لے جائے گا۔

وہ اُسی رات اُسے اپنی ماں سے ملوانے لے گیا۔ ماں نے جب ایک انگریزن کو اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ اُسنے مرینا کو سینے سے لگایا۔ اُسکے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے جی بھر کے دعائیں دیں۔ کپٹین کشور مترجم کا کام کر رہا تھا۔ وہ کشمیری کو انگریزی میں اور انگریزی کو کشمیری میں ترجمہ کرکے ایک دوسرے کا سنا دیا کرتا تھا۔ مرینا کو اماں کے ہاتھوں کا بنا کھانا بہت پسند آیا تھا۔ وہ بار بار اُسکے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔ کپٹین مارے خوشی کے پھول کے کپا ہوا جا رہا تھا۔ اُسے یہ بات اب پوری طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ مرینا اُس سے پیار کرنے لگی ہے اس لئے وہ اُسکی ماں سے اتنا پیار جتا رہی ہے۔

اگلے روز کپٹین کشور اُسکے لئے زری کا کام کیا ہوا ایک پھرن لے کے گیا۔ مرینا نے اُسکا یہ تحفہ بخوشی قبول کیا اور وہ یہی پھرن پہن کے دوسری بار اُسکی ماں سے ملنے چلی گئی۔ ماں اُسے روایتی کشمیری پیرہن میں دیکھ کر بلیوں اُچھل پڑی۔ اُسنے ماں سے کہا کہ وہ چولھے میں اُسکا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ جب وہ

اماں کے ساتھ کچن میں بیٹھی اُسکا ہاتھ بٹا رہی تھی تو کپٹین کشور باہر بیٹھ کر آنے والے کل کے سپنے سنجو رہا تھا۔ کل کے مسرت آمیز سپنے۔ جن میں پیار کی گہرائیاں تھیں۔ بچوں کی کلکاریاں تھیں۔ فرحت بخش لمحوں کی چہکار تھی۔ زندگی کا سنگیت تھا۔ پیار کے گیت تھے۔

مرینا جتنے دن کشمیر میں رہی وہ ایک پل بھی کپٹین سے دور نہ رہی۔ کپٹین بھی دل و جان اُس پر قربان کر کے بیٹھا تھا۔ وہ اُسے ہوٹل سے اُٹھا کر اپنے گھر پہ لے آیا تھا۔ وہ اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اماں بہت جلد ان دونوں کا نکاح ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ مرینا شاید اسی لئے اپنے آپ کو کشمیری کلچر میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک دن مرینا سویرے سویرے تیار ہوگئی۔ اُسنے کپٹین سے کہا کہ اُنہیں ایرپورٹ پہونچنا ہوگا۔ وہ اُسے ایک سرپرائز دینا چاہتی ہے۔ کپٹین کشور کے من ہی من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مرینا نے اپنے ماں باپ کو اس نکاح میں شامل ہونے کے لئے آسٹریلیا سے بلایا ہوگا۔ اُسنے ایک عمدہ سوٹ پہن لیا تاکہ مرینا کے ماں باپ پر رعب پڑ جائے اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ جائیں کہ وہ اپنی بیٹی کو جس کے پلے باندھنے جا رہے ہیں وہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں ہے بلکہ ایک باعزت اور اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ وہ اُسے ایرپورٹ لے گیا۔

مرینا اندر چلی گئی۔ فلائٹ آ چکی تھی۔ مسافر باہر آ رہے تھے۔ مرینا ایک نوجوان کے ساتھ باہر آ گئی۔ کپٹین کشور کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ مرینا نے ماں باپ کو نہیں بلکہ اپنے بھائی کو بلایا ہے۔ وہ جب کپٹین کی گاڑی کی پاس پہونچ گئے تو کپٹین کشور اُس انگریز سے تپاک سے ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا تعارف پیش کرتا۔ مرینا نے اُسے اُس سے متعارف کرایا۔

''یہ کپٹین کشور ہے۔ میرا کیب ڈرائیور۔ بہت ہی پیارا آدمی ہے۔ اور یہ میرا بوائے فرینڈ ولیم''

کپٹین کشور کو لگا کہ جو فلائٹ آسٹریلیا سے آنے والی تھی وہ رن وے پر اُترنے کی بجائے سیدھے اُسکے سر پر آ کے گری اور وہ اسکے ملبے کے نیچے دب کر مر گیا۔

☆☆

## فرشتہ

برسات کے موسم کے آتے ہی چناب کے تیورا یکدم بدل جاتے ہیں۔نیلگوں پانی کا رنگ مٹیالا ہو جاتا ہے اور دریا ایک بدمست ہاتھی کی طرح چیختے چھنگاڑتے، کف اُڑاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔کہیں دیو قامت پتھروں سے ٹکراتا ہے تو کہیں اپنے ہی کنارے کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔کہیں کھیت کھلیانوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو کہیں چیڑھ اور دیودار کے پیڑوں کو اُکھاڑ کے اپنے ساتھ بہا کے لے جاتا ہے۔خرام ناز سے بہنے والے چناب کا یہ بھیانک روپ دیکھ کر لوگ حیران نہیں ہوتے ہیں کیونکہ چناب کے یہ روپ اُنکے دیکھے بھالے ہیں۔پچھلے سال یہ چناب کریم بخش کی ہٹی کٹی بھینس کو کھا گیا۔بیچاری چناب کو بڑی نیک ندی سمجھتی تھی۔وہ ہمیشہ اسی دریا کا پانی پیتی تھی۔حسب معمول وہ جب پانی پینے کے لئے پانی میں منہ ڈالنے لگی تو شوریدہ سر موجوں نے اُسکے پاوں تلے کی زمین ہی کھینچ لی۔وہ سیدھے پانی میں جا کر گری۔اُس دن چناب پوری اُچھان پر تھا۔کریم بخش کنارے پر کھڑے کھڑے ہی اپنا سینہ پیٹتا اور بال نوچتے رہ گیا۔دودھیلی بھینس جو اُسکے پریوار کا پالن ہار تھی اُس کو چناب ایک پل میں اسطرح نگل گیا کہ کریم بخش کو اُسکی بو باس تک نہ ملی۔

اس سال کچھ زیادہ ہی غضب ہو گیا۔مختا مائی کا اکلوتا پوت بشیرا کو چناب نگل گیا۔غریب حسب معمول منہ دھونے کے لئے کنارے کی طرف جو بڑھا کہ اچانک پاوں پھسل گیا اور وہ سیدھے دریا میں جا گرا۔آس پاس کئی لوگ کھڑے تھے۔اُنہوں نے بشیرا کو پانی میں گرتے تو دیکھا مگر وہ ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ سب کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔کسی نے بشیرا کو بچانے کی کوشش نہ کی کیونکہ ان سب میں کوئی اچھا تیراک نہ تھا۔وہ بشیرا کو بچانے کی حماقت کر کے اپنے آپ کو موت کے منہ میں جھونکنے کیلئے تیار نہ تھے۔جب مختا مائی تک یہ خبر پہونچی تو وہ پاگلوں کی طرح ننگے پاوں بھاگتی ہوئی آئی اور دریا میں

چھلانگ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ چار چار لوگ اُسے پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ روتی رہی، بین کرتی رہی، سینے پر دوہتھڑ مارتی رہی اور چناب کو کوستی رہی۔ کیونکہ چناب اُسکے پوت کو نگل چکا تھا۔

کریم بخش کی بھینس کی طرح بشیرا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ تو طے تھا کہ چناب اُسے نگل چکا تھا۔ مختا مائی تو سر پر خاک ڈال کے بیٹھی تھی جب کہ بستی والوں نے بشیرا کا غائبانہ جنازہ پڑھ لیا۔ یہ دریا کتنا بے رحم ہے۔ یہ جذبات نہیں دیکھتا۔ یہ مجبوریوں کو نہیں سمجھتا۔ یہ تو برسات کے موسم میں آدم خور بن جاتا ہے۔ کسی کا بھی گھر اُجاڑ سکتا ہے۔ کسی کے ارمانوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

یہ کہانی رام بن کے کوہستانی سلسلے کے تلیٹی پر آباد اُس گاوں کی کہانی ہے جہاں زیادہ تر گوجر اور بکروال رہا کرتے ہیں۔ چناب اس تلیٹی کو چومتے ہوئے اپنے آگے کے سفر کی طرف رواں ہوتا ہے۔ جب جاڑے کا موسم ہوتا ہے تو یہی چناب اُس مریض کی طرح لگتا ہے جس کی بس سانسیں چل رہی ہوں ۔ایک پانی کی دھارا اس دریا میں نظر آتی ہے جو سست خرامی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ تب یہ دریا کتنا شانت اور پرسکون ہوتا ہے۔ جسطرح رذالہ مست ہونے کے بعد خدا کو بھول جاتا ہے اسی طرح چناب پانی کی دولت پا کر اتنا بدمست ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی پاٹ کھانے لگتا ہے۔ چناب کی اصلیت اس بستی میں رہنے والے سبھی لوگ جانتے تھے پھر بھی وہ اسکی طاقت کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ اُسے اپنی طاقت دکھانے لگتے تھے۔ بشیرا نے بھی یہی غلطی کی اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔

بشیرا ایک گبرو نوجواں تھا۔ اُسکے باپ کی بیس برس قبل حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے موت ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی ماں تھی جو اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کے جی رہی تھی۔ آج وہ سہارا بھی چھن گیا تھا۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے مختا مائی نے۔ وہ اس سال بشیرا کی شادی کالو خان بکروال کی بیٹی سے کرنے والی تھی۔ کتنا ارمان تھا اُسے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا۔ آدمی بس خواب دیکھتا ہے۔ ان کا پورا ہونا اُسکے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ جو اس دنیا کو چلانے والا ہے، سارے فیصلے وہی لیتا ہے۔ چاہے تو انہونی کو ہونی کر دے، چاہے تو بنا بنایا کام بگاڑ دے۔ ایک پل میں سب کچھ تحس نحس کر کے رکھ دے۔

ہفتے عشرے تک اس چھوٹی سی بستی میں بشیرا کا چرچا رہا۔ آٹھ دس دن کے بعد لوگ اُسے بھول

گئے۔ بس ایک مختا مائی تھی جو اپنے بچے کو بھلا نہ پائی۔ وہ آج بھی پتھرائی آنکھوں سے اُسکا انتظار کر رہی تھی۔ اُسکا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ بشیرا مر چکا ہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ بیٹھی تھی کہ ایک دن اُسکا بچہ ضرور لوٹ کے آئے گا۔ اُسکا ماننا تھا کہ خدا اتنا بے درد نہیں ہوسکتا جو وہ ایک بیوہ کا آخری سہارا بھی اُس سے چھین لے۔

بشیرا پانی میں جب گرا تو اُسنے خوب ہاتھ پاوں مارے مگر لہروں کے تھپیڑے کے آگے اُسکے ہاتھ پاوں کمزور پڑ گئے۔ اُسے لگا کہ اب وہ بچ نہیں پائے گا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ وہ اُسے اتنی جلدی دنیا سے نہیں اُٹھا لے گا۔ اُسے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ اپنی ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی جس نے اپنی زندگی میں بہت کم سکھ دیکھا تھا۔ قسمت سے ایک موٹا سا گیل اُسی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ بشیرا نے اسی گیل کو سہارا سمجھ کر تھام لیا۔ گیل روانی کے ساتھ بہے جا رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر بشیرا اُس پر سوار ہوگیا اور اپنے آپ کو اس گیل کے حوالے کر دیا۔ اُسکی زندگی کی ڈور اب اس گیل کے ہاتھ میں تھی جو جہاں چاہے وہاں اُسے لے جا سکتا تھا۔

رات بھر وہ اس گیل پر سوار پانی کی تیز لہروں کے ساتھ بہتا رہا۔ صبح کا وقت تھا وہ گیل ایک دیو قامت پتھر سے اُلجھ کر رک گیا۔ بشیرا نے دیکھا کہ کنارا پاس میں ہے۔ اُسنے ایک جست مار کر اپنے آپ کو کنارے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اُسنے اپنے چاروں اطراف ایک طائرانہ نگاہ ڈال دی۔ اُسے آدم نہ کوئی آدم زاد دور دور تک دکھائی دیا۔ وہ گرتے پڑتے آگے بڑھتا گیا تبھی دور اسے ایک اونچا مکان دکھائی دیا جس کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ وہ کافی تھکا ماندہ تھا۔ وہ لشتم پشتم اُس مکان تک پہونچ گیا اور اُسنے ڈرتے ڈرتے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی باہر آیا۔ اُسنے بشیرا کے سراپا کا جائزہ لے کر اُس سے پوچھا۔

''کون ہو تم اور میرے گھر کا دروازہ کیوں کھٹکھٹایا؟''

''چاچا میں ایک اجنبی ہوں۔ مجھے طغیانی یہاں تک بہا کر لے آئی ہے۔ میں نہیں جانتا یہ کونسا علاقہ ہے۔ تم میری کچھ مدد کرو تو بڑی مہربانی ہوگی''

''یہ مرالا سیالکوٹ کا علاقہ ہے پر تم ہو کون اور یہاں تک کیسے پہونچ گئے۔؟''

''میرا نام بشیرا ہے چاچا۔ میں رام بن کا رہنے والا ہوں۔''

''وہی رام بن نا جو اُدھمپور کے مُقبوضہ علاقے میں پڑتا ہے؟''

''جی۔ ہوا یوں کہ میں کل صبح چناب کے کنارے بیٹھ کر وضوع کر رہا تھا کہ میرا پاوں پھسلا اور میں چناب میں گرا۔ بہتے بہتے یہاں تک پہونچ گیا''

اُسکا نام اور پتہ سن کر اُس ادھیڑ عمر کے آدمی کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اُسنے ترحم بھری نظروں سے اُسکی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم مسلمان سہی پر تم تو دشمن کے علاقے سے آئے ہو۔ تم بہت بڑی آفت میں پڑنے والے ہو۔ تم پاکستان کے علاقے میں داخل ہو چکے ہو۔ ابھی مرالا کی پولیس کو جب تمہاری موجودگی کی خبر مل جائے گی تو وہ تمہیں پکڑ کر لے جائے گی۔ پھر تمہارا کیا حال ہوگا یہ تو اللہ ہی جانے''

بشیرا کے پورے بدن میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یتیموں جیسی صورت بنا کر اُس ادھیڑ عمر آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس آدمی نے اُسے اندر بلا لیا اور پھر دروازہ بند کر کے اُسے ایک کمرے میں لے گیا ۔ دوسرے کمرے میں اُسکے بال بچے تھے جو دروازے کی اوٹ میں سے اُسے دزدیدہ نظروں تکے جا رہے تھے۔ بشیرا کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ اُسکی زندگی اُس اُدھیڑ عمر کے آدمی کے ہاتھ میں تھی جو چاہے اُسے زندگی دے سکتا تھا چاہے اُسے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مولا کو یاد کرنے لگا۔ اُسے اپنے سے زیادہ اپنی ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ نہ جانے بیچاری اس وقت کس حال میں ہوگی۔ وہ اسی اُدھیڑ بھن میں تھا کہ وہ آدمی اُسکے لئے چائے لے کر آ گیا۔ اُسکے اس خلوص کو دیکھ کر اُسکی آنکھیں نم ہوئیں۔ اُسنے تحسین بھری نظروں سے اپنے میزبان کی طرف دیکھا جو چائے پیالیوں میں انڈھیل رہا تھا۔

''چاچا میری زندگی اب تمہارے ہاتھ میں ہے'' وہ اُسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولا

''فکر نہ کرو۔ اللہ سبب ساز ہے۔ کوئی نہ کوئی سبیل نکل جائے گی۔ یہ لو چائے پیو۔''

اُسنے کانپتے ہاتھوں سے چائے کا کپ لیا۔ وہ کافی بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ رات بھر وہ کتنی بار مرا تھا

اور کتنی بار جیا تھا۔ اُسنے چائے کے دو چار سپ لئے۔ اُسکے بے جان جسم میں جیسے توانائی بھر گئی۔ اُسکے میز بان نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''گھبراو مت۔ میں کوئی نہ کوئی سبیل نکال لوں گا۔ ایک بات کا دھیان رکھنا۔ جب تک میں نہ کہوں گھر سے باہر مت نکلنا۔ باہر نکلو گے تو دھر لئے جاو گے۔ پھر تمہاری لاش بھی نہیں مل پائے گی۔''

وہ اُسکی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے لگا۔ اُسے لگا کہ خدا نے اُسے ایک فرشتے کی تفویض میں لا دیا ہے اسلیئے اُسکے دل کو تھوڑا سا سکون مل گیا۔ اُسکے محسن نے اُسے اپنے گھر والوں سے ملایا۔ اُسکے چار بیٹے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی کی عمر سولہ سال تھی یعنی اُسنے عنفوان شباب میں قدم رکھا تھا۔ اُسکا نام شبنم تھا۔ کافی خوبصورت تھی وہ۔ باقی سب بالی عمر کے تھے۔ سب سے چھوٹا صرف تین سال کا تھا۔ اسکی بیوی عمر میں اُس سے بہت چھوٹی تھی۔ اس بڑے عیال کو پالنے والا وہ واحد شخص تھا جس کا نام نواب دین تھا جو کہ ایک بہت بڑا جاگیر دار تھا۔ اُسکے یہاں ایک دو مزارع کام کرتے تھے۔ نواب دین شکل سے ہی ڈراونا نہیں لگتا تھا بلکہ وہ فطرت سے بڑا موذی اور ظالم تھا۔ اُسنے اپنے گھر والوں کو ایسے دبا کے رکھا تھا کہ کوئی گھر میں چوں تک نہیں کر سکتا تھا۔ بشیرا اُسکی اصلیت سے بے خبر تھا اسلیئے وہ اُسکے لئے فرشتہ رحمت تھا۔ نواب دین کی ہمدردی پا کر بشیرا کے دل کو قدرے سکون مل گیا۔ وہ کھاپی کے ٹانگیں پھیلا کے سو گیا کیونکہ وہ تکان سے چور ہو چکا تھا۔ پانی کی موجوں سے لڑتے لڑتے اُسکا پورا بدن ٹوٹ چکا تھا۔

اگلے روز جب فجر کی اذان ہوئی تو نواب دین نے بشیرا کو بھری نیند سے اُٹھالیا اور اُسے فوراً وضو کر کے نماز ادا کرنے کے لئے کہا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بشیرا نے فوراً وضو کیا اور نواب دین کے ساتھ بیٹھ کر نماز ادا کرنے لگا۔ نماز سے فارغ ہو کر نواب دین کی بیوی چاندبی بی چائے لے کر آ گئی۔ دونوں نے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد نواب دین نے بشیرا کو بڑے رازدارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دونوں ملکوں کے حالات ٹھیک نہیں چل رہے ہیں۔ اگر تو غلطی سے بھی پاکستانی فوج کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ تمہیں دشمن ملک کا جسوس سمجھ کر مار مار کے تمہارا کچومر نکال دیں گے۔ پھر تمہیں گولی مار کر ختم کر دیں گے۔ ہر پاکستانی کو ہندوستانی سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ وہ چاہے

مسلمان ہو یا کافر اگر تم بے موت مرنا نہیں چاہتے ہو تو تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ تمہیں میرا بھانجا بن کے رہنا ہوگا۔ کوئی پوچھے تو کہنا کہ میں میرپور میں رہتا ہوں۔ میرپور میں واقعی میری ایک بہن رہتی ہے جس کا نام کلسم ہے۔ میں تمہیں اُسکا سارا پتہ ٹھکانہ سمجھا دوں گا۔ تمہیں وہ پتہ ازبر کرنا ہوگا۔ میں اپنی بہن سے بھی بات کر کے رکھوں گا۔ ممکن ہوسکا تو میں تمہاری ایک تصویر بھی کسی کے ہاتھ اُن کو روانہ کردوں گا تاکہ اگر کہیں پوچھ تاچھ ہوئی تو پہچاننے میں کوئی دقت نہ آجائے۔ میں تمہیں یہاں صدار کنے کے لئے نہیں کہوں گا۔ فی الوقت تمہاری سلامتی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ ابتلا کی گھڑی ہے۔ ہمیں ہر طرح سے چوکنا رہنا چاہیے۔ میں گھر والوں کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ یہی کہیں کہ تم ہمارے رشتہ دار ہو اور میرپور سے ہمیں ملنے آئے ہو۔ خبردار کبھی بھولے سے بھی رام بن کا نام مت لینا''

بشیرا نے نواب دین کی ہر بات گرہ میں باندھ لی اور اُسے یقین دلایا کہ وہ اُسی کے کہنے پر چلے گا۔ نواب دین نے اُسکی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر وہ اپنے بچوں کو سمجھانے چلا گیا۔ نواب دین کا خلوص اور اپنا پن دیکھ کر بشیرا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس دھرتی پر ابھی بھی ایسے نیک بندے رہتے ہیں جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کسی غیر کی مدد کرتے ہیں۔

دو تین دن خیر سے گزر گئے۔ چوتھے دن نواب دین نے بشیرا کو اپنے ساتھ کھیتوں پر چلنے کے لئے کہا۔ وہاں پر دو مزارعے کام کر رہے تھے۔ ایک مزدور کام میں اتنا مشغول تھا کہ اُسے نواب دین کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ نواب دین کو اُسکی یہ بدتمیزی اتنی کھل گئی کہ بغیر کسی قصور کے اُسنے اُسکی پٹائی کی اور پھر اُسے لات مار کر بھگا دیا۔ اُسنے اُس کی جگہ بشیرا کو کام کرنے کے لئے کہا۔ بشیرا محنتی تھا۔ جفاکش تھا۔ اُسکی زندگی کشاکش اور جدوجہد سے ہمیشہ بھری رہتی تھی اسلئے محنت کرنے سے وہ کبھی گھبرایا نہیں۔ نواب دین نے اُسے کھیت جوتنے کے لئے کہا۔ بشیرا نے خوشی خوشی ہل کو تھاما اور وہ کھیت کی جتائی کرنے لگا۔ نواب دین کھیت کی منڈھیر پر بیٹھ کر بڑا مسرور اور شادماں نظر آرہا تھا۔

بہت جلد نواب دین اپنی اصالت دکھانے لگا۔ وہ بشیرا سے ایسے کام لیتا تھا جیسے وہ اُسکا زرخرید غلام ہو۔ اُسے پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ بیچارا خوف و ہراس کے سایے میں جی رہا تھا۔ اُسے

ہمیشہ یہ کھٹر کا لگا رہتا تھا کہ کہیں نواب دین کی نیت نہ بدل جائے اور وہ اُسے فوج کے حوالے نہ کر دے اسلئے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے طوعاً وکراہاً وہ سب کچھ کرنا پڑتا تھا جو اُسنے پہلے کبھی کیا نہیں تھا۔نواب دین اُسے پو پھٹنے سے پہلے ہی بڑی بے رحمی سے اُٹھاتا تھا اور پھر اُسے مویشی خانے کو صاف کرنے کے لئے کہتا تھا۔وہاں سے ابھی فرصت ملی نہیں کہ وہ اُسے ساگ زار میں پانی دینے کا حکم صادر کر دیتا تھا۔وہاں سے فارغ ہوا تو چاند بی بی اُسکے سامنے برتنوں کا ڈھیر لگا دیتی تھی جنہیں وہ پاس بہنے والی ندی سے دھو کر آتا تھا۔وہ بڑی تکلیف میں تھا۔نواب دین فوج کی ہوا دکھا کر اُسکا بھرپور استحصال کئے جا رہا تھا۔وہ ایسا بے بس اور لاچار تھا کہ کسی کو اپنا دکھڑا ابھی نہیں سنا سکتا تھا۔اس گھر میں ایک شبنم تھی جو اسکے دکھ و درد کو سمجھ سکتی تھی پر وہ بھی لاچار تھی۔وہ اُسکی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ باپ سے ہمیشہ دبی دبی اور ڈری ڈری رہتی تھی۔

ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد گھر لوٹا تو اُسنے ایک فوجی کو نواب دین کے گھر میں پایا۔فوجی کو دیکھ کر اُسکے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔اُسکے اوسان خطا ہو گئے۔وہ تھر تھر کانپنے لگا۔فوجی نے اُس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر نواب دین سے پوچھا۔"یہ لونڈا کون ہے۔پہلے کدی اسے دیکھا نہیں"

بشیرا کیا کلیجہ بیٹھا جانے لگا۔اُسے لگا کہ نواب دین ابھی اُسکی اصلیت فوجی کے سامنے افشا کر دے گا اور پھر اُس پر قہر ٹوٹے گا پر نواب دین نے ہنستے ہوئے فوجی سے کہا۔"ارے وہ ساڑھی کلسم ہے نا میر پور والی۔یہ اُسی دا منڈا ہے۔اتھے کام کاج ڈھونڈنے واسطے آیا ہے۔"

"او یہ کلسم آپا دا پتر ہے۔مینوں لگا یہ کوئی بھارتی جسوس ہے۔بخدا کئی روز سے نا میرے ہاتھوں وچ کھجلی ہو رہی ہے۔کوئی جسوس ہتے نہیں لگ رہا ہے۔اللہ میاں کی قسم وہ حال کر کے چھڑوں گا اُسکا کہ دو گز کفن بھی نہ ملے دفنانے کے واسطے"

بشیرا پر لرزہ طاری تھا۔اُسکے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔اُسکی ٹانگوں کو جیسے لقوہ مار گیا تھا۔وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہا تھا۔نواب دین اُسکی حالت سمجھ گیا۔اُسنے بڑے پیار سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔"جا پتر کھانا کھا لے۔تیری مامی کب سے تیرے انتظار میں بیٹھی ہے"

بشیرا فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ اُسے لگا کہ اُس کے سر سے قیامت ٹل گئی ہے۔ چاند بی بی نے اُسے دو نوالے کھانے کو دئے۔ یہ عورت اپنے شوہر سے بھی زیادہ کنجوس اور خسیس تھی۔ اُسنے دو نوالے جیسے تیسے اُگل نگل کے کھا لئے اور پھر وہ اپنے کام پر چلا گیا۔

ایک دن کیا ہوا، گھر کے سبھی لوگ کسی رشتہ دار کی شادی میں چلے گئے تھے۔ گھر میں بشیرا اکیلا تھا۔ وقت گزاری کے لئے اُسنے گھر کی صفائی شروع کردی۔ صفائی کرتے کرتے اُسکے ہاتھ جو تصویر لگی اُسے دیکھ کر اُسکے ہوش اُڑ گئے۔ یہ تصویر نواب دین کی تھی جو کہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اپنے آپ کو اجگر سے بچانے کے لئے وہ اجگر کی بانبی میں ہی گھس گیا تھا۔ وہ اپنی قسمت کی ستم ظرفی پر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اُسکا جی تلے اوپر ہونے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ موت کے منہ میں پھنسا ہوا تھا۔ نواب دین کو اُس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ ہمدردی کے نام پر اُسکا خوب استمال کر رہا تھا۔ وہ اس زندان سے بھاگ جانا چاہتا تھا پر وہ جائے کہاں۔ جب منصف ہی جلاد ہو تو فریاد کس سے کرے۔ وہ بیٹھ کر زار زار رونے لگا۔ یہ قسمت نے اُسکے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا اُسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کرے تو کرے کیا۔ کسے اپنی فریاد سنائے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اب یہاں سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔ وہ موت کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔ اُسنے فیصلہ کیا کہ روز روز کے مرنے سے اچھا ہے کہ ایک بار ہی مرا جائے۔

رات کو نواب دین اور اُسکی بڑی بیٹی ہی گھر لوٹے۔ باقی وہیں رکے۔ نواب دین کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ بشیرا گھر میں ہی موجود ہے۔ بشیرا غم والم کی مورت بنا بیٹھا تھا۔ نواب دین نے قدرے برہمی سے پوچھا۔ ''کیوں بے تیری اماں مر گئی کیا جو ایسی رونی سی صورت بنائے بیٹھے ہو؟''

''چاچا میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے میری ماں کی بہت یاد آرہی ہے''

''اماں کو بھول جا۔ وہ تو کب کی ٹیں ہوئی ہوگی۔ تو بس اپنے کام سے کام رکھ۔ یہ سارے دنیاوی جھنجٹ چھوڑ دے۔''

''چاچا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔'' اُسنے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اُسکا یہ ارادہ دیکھ کر نواب دین کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایکدم آگ ببھوکا ہو گیا۔ وہ بشیرا پر بھوکے

بھیڑئے کی طرح ٹوٹ پڑا اور مار مار کے اُسکا پلتھین نکال کے رکھ دیا۔ شبنم جو دروازے کی اوٹ میں کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اُسکا یہ حال دیکھ کر اُسکا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ زخموں سے چور زمین پر چت پڑا تھا اور نواب دین غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اُسنے بشیر اکو ٹھوکر مار کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

''جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اُسکے پر نکل آتے ہیں۔ تمہارے بھی پر نکل آئے ہیں نا۔ اب دیکھ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔''

کہہ کر وہ تمتماتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا۔ باہر آکر اُسنے دروازہ بند کر کے اُس پر کنڈی لگا دی اور پھر وہ تہدیدی انداز میں شبنم سے بولا۔ ''جب تک میں نہیں لوٹوں اس لونڈے پر نگاہ رکھنا۔'' کہہ کر وہ چلا گیا۔ شبنم خود اس زندان میں گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بھی اس زندان سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اُسکے جاتے ہی اُسنے ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھولا دیکھا کہ بشیرا گھٹنوں میں سر ڈالے رو رہا تھا۔ وہ اُسکے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی اور اُسے تسلی دے کر بولی۔

''مرد ہو کے ہمت ہارتے ہو۔ مجھے دیکھ میں بھی گھٹ گھٹ کے جی رہی ہوں۔ میرا باپ انسان نہیں جلاد ہے۔ وہ اگر تمہارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا ہے تو ہمیں کونسا سکھ دے رہا ہے وہ۔ تم اس زندان سے نکل جانا چاہتے ہو؟''

اُسنے رحم طلب نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلایا۔ شبنم نے اُسکا ہاتھ اپنے میں لے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور پھر وہ اُسے کھینچتے ہوئے بولی۔

''اس سے پہلے کہ میرا باپ پولیس لے کر آجائے تم میرے پیچھے چلتے رہو۔ میں یہاں کے سبھی چور رواستوں سے واقف ہوں۔''

بشیرا تو پہلے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شبنم کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ شبنم اُسکے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ وہ شبنم کے پیچھے پیچھے بغیر تھکے، بغیر رکے چلتا گیا۔ شبنم اُسے چناب کے راستے سے لے کر گئی۔ شبنم یہاں کے چپے چپے سے واقف تھی۔ جب تک نوب دین پولیس لے کے پہونچ جاتا وہ دونوں اُسکی پہونچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔

مختا مائی نے جب اپنے پوت کو اپنے سامنے زندہ سلامت پایا تو اُس پر جیسے شادمرگی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ بیٹے سے لپٹ کر پھپھک کر روتی رہی۔ بشیرا نے اپنی ماں کے آنسو پونچھے اور پھر شبنم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''اماں تیرے بیٹے کو تجھ تک زندہ سلامت پہونچانے والی یہ فرشتہ صفت لڑکی ہے جس نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر میری مدد کی۔ یہ مجھے نہیں بچاتی تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سو گیا ہوتا۔''

مختا مائی نے احسانمند نگاہوں سے شبنم کی طرف دیکھا اور پھر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ شبنم کو لگا کہ اُسے دونوں جہاں ایک ساتھ مل گئے ہوں۔

# حسن بنگالی حاظر ھے

بنگال کی ریاست سے اُسکا دور کا بھی واسطہ نہ تھا پھر بھی وہ حسن بنگالی کے نام سے جانا جاتا تھا۔
حسن بنگالی کا اصلی نام غلام حسن خان تھا۔ بہت کم لوگ اُسے اُسکے اصلی نام سے جانتے تھے جب کہ عام لوگ اُسے حسن بنگالی کے نام سے پکارتے تھے۔ اُسکا رنگ کالا تھا۔ جسم بے ڈول۔ آنکھیں چھوٹی اور ماتھا چوڑا۔ اسکا یہ رنگ وروپ، بنگالی کے نام سے کسی حد تک میل کھاتا تھا۔ اصل میں اس بنگالی لاحقے کے پیچھے کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ حسن بنگالی محکمہ ٹرانسپورٹ میں ڈرائیور تھا اور لانگ روٹ کی ٹرک چلایا کرتا تھا۔ وہ ہر ماہ سری نگر سے دلی کے ایک دو پھیرے لگاتا تھا۔ فطرت سے عیاش تھا۔ دارو اور عورت اُسکی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اتنا ہی نہیں اُس پر اغلام بازی کا بھی الزام تھا اسلیئے کوئی بھی کلینز اُسکے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ یا تو بنا کلینز کے ہی چلتا تھا یا کوئی بوڑھا بیمار کلینز اُسکے سنگ ہو لیتا۔ دلی میں مال اُتارتے ہی وہ ٹرک ڈیپو میں کھڑا کرتا تھا اور خود جی بی روڑ کے کوٹھے کا طواف کرنے نکل جاتا تھا۔ اس ریڈ لائٹ ایریا کے بیشتر بھڑوے اُسکے شناسا تھے۔ وہ چالیس سال کی عُمر پار کر چکا تھا لیکن مجرد و تنہا زندگی گزار رہا۔ اُسکے گھر میں ایک بوڑھی ماں تھی جو بس رات دن اُسکی شادی میں گھلی جا رہی تھی۔ حسن بنگالی بدنام زماں تھا۔ ایسے میں کوئی اُسے اپنی بیٹی کیسے دے سکتا تھا۔ اپنا کنوارا پن مٹانے کے لئے وہ ایک بار ایک کالی کلوٹی عورت کو بیاہ کر لے آیا۔ وہ کہاں کی تھی یہ کسے کو معلوم نہ تھا۔ لوگوں نے یونہی اُسے بنگال کی سمجھ لیا۔ اُس عورت کے آنے سے حسن خان، حسن بنگالی ہو گیا۔ شومئی قسمت وہ عورت ایک مہینے سے زیادہ جی نہیں پائی۔ وہ تپ دق کے مرض میں مبتلا تھی۔ علاج میں لاپرواہی برتنے کے سبب وہ عورت بھری جوانی میں لقمہ اجل بن گئی۔ وہ چلی تو گئی مگر حسن بنگالی کے لئے ''بنگالی'' لاحقہ چھوڑ کے گئی۔

اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لئے وہ گاہے بگاہے کوٹھوں کا رخ کر ہی لیتا تھا۔ اُسکی ساری حرام کی کمائی ان ہی راستوں سے نکل جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ کنویں کی مٹی کنویں کو ہی لگ جاتی ہے۔ یہی حال حسن بنگالی کا تھا۔ وہ تیل بیچ کر اور زائد مال لاد کر جو کچھ کماتا تھا وہ چند لمحوں کے تلذذ میں بہتے ریلے کی طرح نکل جاتا تھا۔ اُسے اس بات کا قطعی غم نہ تھا۔ وہ تو جسمانی تسکین پا کر سب کچھ خوشی خوشی ہار جاتا تھا۔

اُس دن بھی وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ نیچے ایک دلال ملا اُسنے سرگوشیانہ انداز میں اُس سے کہا۔

''بنگال سے آج ہی تازہ تازہ مال آیا ہے۔ دیکھنا چاہو گے؟''

حسن بنگالی ایک بھوکے انسان کی طرح للچائی نگاہوں سے دلال کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اُسکے سامنے ضیافتیں لے کے کھڑا ہو۔ وہ اُسکے ساتھ ایک کوٹھری میں چلا گیا جہاں پر چار لڑکیاں ایک کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھیں۔ حسن بنگالی کی نظر اُن میں سے ایک لڑکی پر مرکوز ہوگئی۔ وہ پہلی ہی نظر اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ یہ لڑکی جسکی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی تھی ان چاروں میں یکتا اور منفرد لگ رہی تھی۔ سانولے رنگ اور چھریرے بدن والی یہ لڑکی جسکے بال ٹخنوں تک لہرا رہے تھے۔ جسکی آنکھوں میں جیسے موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، ایک ہی نظر میں حسن بنگالی کا دل لوٹ کر لے گئی۔ حسن بنگالی گرسنہ نگاہوں سے اُس لڑکی کو یوں گھورنے لگا جیسے وہ اُسے کچا ہی کھا جانا چاہتا ہو۔ لڑکی کی حالت بڑی دگرگوں تھی۔ اُسکے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک معصوم التجا اور فریاد تھی۔ بمشکل تمام وہ روتے روتے حسن بنگالی سے اپنے دل کا درد بیان کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

''دیکھئے میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ یہ لوگ مجھے شادی کرانے کے بہانے یہاں لے آئے اور اب مجھ سے دھندہ کروانا چاہتے ہیں۔ میں مرجاوں گی مگر میں ایسا گندا دھندہ کبھی نہیں کروں گی''

اُسکی فریاد سن کر حسن بنگالی کا دل ایکدم پسیج گیا۔ اُسنے دل ہی دل میں یہ عہد کرلیا کہ وہ اس لڑکی کو ایک رات کے لئے نہیں بلکہ ساری زندگی کے لئے خرید لے گا۔ حسن بنگالی نے جب دلال سے اُس لڑکی کی قیمت پوچھی تو قیمت سن کر وہ ایک لحظ کے لئے چکرا کے رہ گیا۔

''لڑکی کی ابھی نتھ بھی نہیں اُتری ہے بھائی۔ کسی دھنا سیٹھ کے پاس جائے گی نا تو اسکا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ آپ چونکہ ہمارے پرانے گاہک ہو اسلئے آپ کے لئے ایک رات کے صرف دس ہزار روپے۔ دس ہزار سے ایک پائی کم نہیں''

''میں تم سے ایک رات کا سودا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بتاو اس لڑکی کو اپنے ساتھ لیجانے کے کتنے پیسے دینے ہونگے؟''

''چالیس ہزار روپے'' وہ بنا کسی تامل کے بولا۔

حسن بنگالی بڑی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ چالیس ہزار کا بندوبست دلی جیسے شہر میں کرنا آسان نہ تھا۔ کشمیر ہوتا تو بات الگ تھی۔ وہ کسی سے اُدھار مانگ سکتا تھا۔ اپنا گھر گروی رکھ سکتا تھا۔ یہاں کون اُسے جانتا تھا اور اتنی بڑی رقم کوئی بھلا کیوں دیتا۔ وہ عجب گومگو کی حالت میں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اُس نے آج ہی اس لڑکی کا سودا نہ کیا تو یہ لڑکی کل تھوڑے ہی اُسے ملے گی۔ ملے گی بھی تو ایک مسلے کچلے باسی پھول کی طرح جو گھر کے گلدان میں سجانے کے قابل ہی نہیں ہوگی۔ وہ گوشت خور ضرور تھا پر وہ باسی گوشت کھانے کا عادی نہ تھا۔ سو اُس نے سوچا کہ اس لڑکی کو اپنے گھر کی زینت بنانے کے لئے اُسے جو کچھ کرنا ہے سو آج ہی کرنا ہوگا۔ اُسنے دلال سے ایک رات کی مہلت مانگی اور اُس سے یہ وعدہ لیا کہ جب تک وہ پیسے لے کے نہیں آئے گا یہ لڑکی اُس کے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔ دلال نے اُسے یقین دلایا کہ یہ لڑکی تب تک ان چھوئی رہے گی جب تک وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔

حسن بنگالی وہاں سے نکل کر سیدھے اپنے ڈپو میں چلا گیا اور اپنے ٹرک کے پاس بیٹھ کر سوچ بچار کرنے لگا۔ چالیس ہزار کی رقم کا سوال تھا۔ یہ رقم وہ کہاں سے حاصل کر سکتا ہے۔ دو گھنٹے تک وہ عقل و فہم کے سارے دشت کھنگال کے رہ گیا۔ آخر دو گھنٹے تک عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بعد اُسکے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ وہ فوراً اُٹھا، گاڑی کا دروازہ کھولا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اُسنے گاڑی اسٹارٹ کی۔ چوکیدار نے روک کر پوچھا۔

''اے بنگالی گاڑی کہاں لے کے جا رہے ہو؟''

''پرسارام بھائی گاڑی مسنگ کر رہی ہے۔ کل سری نگر کے لئے نکلنا ہے نا اسلئے ابھی مستری کو گاڑی دکھا کر آتا ہوں۔ تم بھی چلنا چاہتے ہو تو چلو''

''ٹھیک ہے ٹھیک جاو پر رات کو گاڑی باہر مت رکھنا۔''

حسن بنگالی گاڑی نکال کر لے گیا اور سیدھے صدر بازار کی طرف گاڑی دوڑانے لگا۔ ایک مستری جو کہ اُسکی جان پہچان کا تھا اُسنے اُسکے گیراج کے آگے اپنا ٹرک کھڑا کیا۔ ایک بونے قد کا مستری

دوڑ کر اُسکے پاس آیا۔ حسن بنگالی نے سرگوشیانہ انداز میں اس سے کہا۔

''حمید بھائی تین سال پرانا ٹرک ہے۔اسکا انجن اگر میں کسی پرانے انجن سے بدل دوں تو کتنا ملے گا؟''

''پہلے میں ٹرک کے کاغذات دیکھ لوں گا، پھر کچھ کہہ پاوں گا''

حسن بنگالی نے اُسے ٹرک کے کاغذات دکھائے۔مستری نے سارے کاغذات ایک ایک کر کے دیکھے، پھر انجن کا معائنہ کیا۔ایک دو بار گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھی۔جب وہ پوری طرح مطمعن ہو گیا تو اُسنے حسن بنگالی سے پوچھا۔

''کوئی لوچا تو نہیں ہوگا نا؟''

''کس بات کا لوچا۔گاڑی کشمیر کی، ادلا بدلی دلی میں ہوگی۔فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر لگ نہیں پائے گی۔اگر لگ بھی گئی تو معاملہ لے دے کے میں نپٹا لوں گا۔بس ایک مہربانی کرنا۔گاڑی میں ایسا انجن ڈال دینا جو سری نگر تک پہونچ جائے۔ایک بار گاڑی یارڑ میں پہونچ گئی نا تو پھر سمجھو نیا پار ہوگئی۔''

''میرے پاس ٹاٹا کا ہی انجن ہے۔تیرہ سال پرانا ہے۔سری نگر تک چل تو جائے گا مگر تیل ،موبائل بہت کھائے گا۔''

''تیل کا کوئی مسلہ نہیں۔بس انجن بند نہیں پڑنا چاہے''

''انجن کی گارنٹی میری۔اگر راستے میں کہیں بند پڑ گیا نا تو میں ہرجانہ دوں گا۔یہ میرا وعدہ رہا''

پچپن ہزار میں انجن کا سودا طے ہو گیا۔حمید مستری نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے انجنوں کی ادلا بدلی کردی۔دو گھنٹے کے بعد حسن بنگالی کی جیب میں پچپن ہزار کے نوٹ تھے۔اُسنے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ سیدھے ڈپو میں چلا گیا۔ڈپو میں گاڑی کھڑی کر کے وہ چوروں کی طرح ڈپو سے نکلا اور باہر ایک رکھشا پکڑ کر سیدھے جی بی روڑ کی طرف روانہ ہوا۔جی بی روڑ پہونچ کر جونہی وہ رکھشا سے اُترا تو وہ دلال دوڑ کر اُسکے پاس آ گیا جسکے ساتھ اُسنے لڑکی کا سودا کیا تھا۔اُسنے بڑی بے صبری سے حسن بنگالی سے پوچھا۔

''رقم کا انتظام ہو گیا کیا؟''

جواب میں حسن بنگالی نے جیب سے نوٹوں کی گڑیاں نکالیں اور اُسے چالیس ہزار گن کر دیتے ہوئے بولا۔

''یہ لو بھائی پیسے۔ پورے چالیس ہزار ہیں۔ اب تو اپنا سودا پکا ہے نا بھائی۔''

''بھائی سو ٹکے پکا'' دلال دانت نکوستے ہوئے بولا۔

''میں کل مال بھر کے دوپہر تک یہاں سے نکل جاوں گا۔ میں آج رات لڑکی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ تم کو ایک مہربانی کرنی ہوگی مجھ پر۔ آج کی رات لڑکی کو اپنے کوٹھے پر ہی رکھنا ہوگا۔ میں کل شام تک اسے یہاں سے نکال کرلے جاوں گا۔ کیا تم میرے لئے اتنا کر پاوگے؟''

''بھائی آپ کے لئے تو جان حاضر ہے۔ بس جتنی جلدی ہو سکے چھوکری کو یہاں سے لے کر جاو۔ خدا نہ کرے کہیں پولیس کی ریڑھ ویڑھ پڑ گئی نا تو سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا''

''بس آج رات کی ہی تو بات ہے۔ انشااللہ میں کل جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے نکال کر لے جاوں گا۔ ابھی ایک گزارش ہے تم سے۔ کیا میں ایک بار اُس لڑکی سے مل سکتا ہوں۔''

''بھائی اس میں مجھ سے پوچھنا کیا۔ تم نے اتنی بڑی رقم دے کر اُسے خرید لیا۔ اب تو وہ سر سے پاوں تک تمہاری ملکیت ہے۔ آو میرے ساتھ''

وہ شاداں وفرحاں دلال کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ آنکھوں میں جیسے اُسی کی شبہ ناچ رہی تھی۔ وہ لڑکی ابھی بھی سہمی سکڑی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ حسن بنگالی اُسے دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گیا۔ وہ کچھ شرماتے کچھ جھجکتے اُسکے پاس چلا گیا اور اُسکے پہلو میں بیٹھ کر اُس سے بڑے رومانی انداز میں کہنے لگا۔

''تم ان سب میں یکتا ہو۔ تم بہت حسین ہو۔ میں نے جیسے ہی تمہیں دیکھا، اُسی لحظ میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔ تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دوں گا۔ اس زلت بھری دنیا میں پھر کوئی تمہیں دھکیلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اب تم خوش ہو نا؟''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک ہلکی سی خوشی کی لہر اُسکے سانولے چہرے پر دوڑنے

لگی۔ اُسنے حسن بنگالی کی طرف پہلی بار پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ حسن بنگالی پر جیسے خمار چڑھ گیا۔ وہ اُسکے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولا۔

''تم اب بالکل غم مت کرنا۔ میں کل تمہیں لینے آوں گا۔ پھر ہم اپنے گھر چلے جائیں گے۔ جانتی ہو میرا گھر کہاں ہے؟''

اُسنے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ اُسنے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میرا گھر کشمیر میں ہے جسے جنت کہتے ہیں۔ میرے گھر میں میری بوڑھی ماں تمہیں پلکوں پر بٹھا کے رکھے گی۔ کبھی تمہیں ماں باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دے گی۔ اب میں چلوں۔ دیر ہورہی ہے مجھے ڈیوٹی پر حاضر رہنا ہے''

یہ کہہ کر اُسنے اُسکے ہاتھ کا بوسہ لیا اور پھر وہ اُسے خوابوں کے سہارے چھوڑ کر چلا گیا۔

اگلے روز وہ سویرے سویرے اُٹھا۔ بابو کی جیب گرم کی اور ایک فیکٹری میں لوڈنگ کرنے چلا گیا۔ دو بجے تک لوڈنگ سے فارغ ہو کے اُسنے چالان بنوالیا اور گاڑی کو متھرا روڑ پر کھڑی کر کے جی بی روڑ کے کوٹھے پر چلا گیا۔ وہاں سے لڑکی کو آٹو میں بٹھا کر وہ ٹرک تک لے آیا۔ اس بار اُسکے ساتھ جو کلینر تھا اُسکا نام سلیم پاشا تھا جو کہ عمر میں اپنے اُستاد سے دس سال بڑا تھا۔ اُسنے جب اُستاد کو ایک لڑکی کے ساتھ آٹو سے اُترتے دیکھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ حسن بنگالی نے سلیم پاشا سے چہکتے انداز میں کہا۔

''ارے ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہے۔ اسے سلام تو کر''

سلیم پاشا نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ہونے والی بھابی کو سلام کیا۔ حسن بنگالی نے اُسے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور سلیم پاشا کو ٹرک کے پیچھے بٹھا دیا۔ سلیم پاشا اس بے رخی سے جل بھن کے رہ گیا ۔وہ من ہی من میں اُسے صلواتیں سناتے ہوئے ٹرک کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ٹرک غروں غروں کی آواز کے ساتھ دھواں اُڑاتے ہوئے چلنے لگی۔ سلیم پاشا ٹرک کے اسطرح دھواں اُڑانے پر حیران و پریشان ہو کر رہ گیا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد جب ٹرک ایک ناکے پر رکا تو سلیم پاشا دوڑ کر حسن بنگالی کے پاس چلا گیا اور اُس

سے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''اُستاد آتے وقت تو گاڑی دھواں نہیں دے رہی تھی۔ اب یہ جاتے ہوئے اتنا دھواں کیوں پھینک رہی ہے''

حسن بنگالی پہلے چونکا پھر اُس نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے سلیم پاشا سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ مستریوں نے پرانا موبل آئیل ڈال دیا ہے۔ کل انشا اللہ جب ہم یارڑ میں پہونچ جائیں گے تو میں ورکس منیجر سے اس بات کی شکایت ضرور کروں گا''

سلیم پاشا کا اس جواب سے اطمینان تو نہیں ہوا بہر حال اُس نے اُستاد سے حجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کہیں نہ کہیں اُسکے دل میں کئی سارے شک وشبہات سر اُٹھانے لگے تھے۔ تاہم اُسنے چپ رہنے میں ہی بھلائی سمجھی۔

تین دن کے بعد وہ سری نگر پہونچ گئے جب کہ دو دن میں پہونچ جانا چاہے تھا۔ گاڑی کہیں گرم ہو کے بند پڑتی تھی تو کہیں چڑھائی دیکھ کے ہی ہانپنے لگتی تھی آتے ہوئے تو یہی ٹرک شیر کی طرح دہاڑتا تھا۔ یہ جاتے ہوئے ایسا کیا ہوگا جو یہ ٹرک اتنی ساری بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ وجہ سلیم پاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ من ہی من میں بڑی چھان پھٹک کے باوجود کسی نتیجے پر نہیں پہونچ پا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ٹرک سری نگر پہونچ گیا۔ حسن بنگالی نے مال ان لوڑ کر کے گاڑی ورکشاپ کے متھے ماردی اور خود اپنی بیگم کو بڑے ناز وانداز کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔

اُسکی بوڑھی ماں نبلہ نے جب بیٹے کو دیکھا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ جب اُسکے پیچھے کھڑی لڑکی پر اُسکی نظر پڑی تو پل بھر کے لئے وہ ٹھٹکی پھر بے چینی سے بولی۔ ''یہ کون ہے بیٹا؟''

''موجی یہ تمہاری ہونے والی بہو ہے''

بہو کا نام سن کر نبلہ کے کانوں میں جیسے خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ ممتا بھری نظروں سے اُس لڑکی کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اُسنے بڑھکر اپنے سینے سے لگایا اور اُسکی بلائیاں اُتارتے ہوئے وہ اُسے اندر لے آئی۔ آن کی آن میں یہ خبر گاوکدل کے پورے محلے میں پھیل گئی کہ حسن بنگالی کسی بنگالی ساحرہ کو بیاہ کر

لے آیا ہے گھر میں ملنے والوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ جو بھی آتا تھا نبلہ کو بہو لانے کی مبارک باد دیتا۔ نبلہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حسن بنگالی کے اسطرح باہر کی لڑکی لانے پر خفا بھی تھے۔ نبلہ تو جی اُٹھی تھی۔ جس آس کو لے کر وہ دن رات جی رہی تھی آج اُس کے بیٹے نے اُسکی آس مراد پوری کی تھی۔ رحیم لنگڑا جو کہ کئی سال تک اسی محکمے میں کلینر کا کام کرتا تھا۔ ایک حادثے میں ٹانگ کٹ جانے کے باعث اُسے اس نوکری سے استعفا دے دیا تھا۔ اب وہ ایک ورکشاپ چلاتا تھا۔ اُسکے لنگڑے پن کی وجہ سے اُسکی شادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ مبارک دینے والوں میں سب سے پیش پیش تھا۔ وہ بار بار حسن بنگالی سے ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

''بھائی میرا بھی کچھ بھلا کر دو۔ جتنے پیسے خرچ کرنے پڑیں میں خرچنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے لئے بھی ایسی ہی ایک لڑکی ڈھونڈ و نا''

''لڑکی تو ملے گی پر کم سے کم لاکھ روپے خرچہ کرنا پڑے گا۔ کیا تم اتنے پیسے خرچنے کے لئے تیار ہو؟''

''لاکھ کیا، میں ڈیڑھ لاکھ ایک خرچنے کے لئے تیار ہوں، پر شرط یہ ہے کہ لڑکی ایسی ہی ہونی چاہے۔ نازک، حسین اور لمبے بالوں والی''

''دو تین مہینے انتظار کرو۔ جب میں اگلی بار دلی چلا جاوں گا تو تمہارے لئے ایک لڑکی ضرور ڈھونڈ لوں گا''

رحیم لنگڑا اس یقین دہانی کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ایک ہفتہ تو شادیانے میں کٹ گیا۔ ایک ہفتے کے بعد سلیم پاشا حواس باختہ حسن بنگالی کے گھر پر آ گیا۔ اُسنے جو خبر بنگالی کو سنائی، اُسے سن کر اُسکے ہوش اُڑ گئے۔ اُسکا بھانڈہ پھوٹ چکا تھا۔ اُسکی بے ایمانی پکڑی گئی تھی۔ اس بات کا پتا لگتے ہی کہ حسن بنگالی نے گاڑی کا انجن بدل دیا ہے، آناً فاناً اُسکے معطلی کے احکامات جاری ہوئے۔ سلیم پاشا اندر سے خوش تھا کہ اُسکے اُستاد کو معطل کر دیا گیا تھا مگر اوپری دل سے وہ ہمدردی جتانے آیا تھا تا کہ اُسکے اُستاد کو یہ شک نہ ہو جائے کہ اُس کے اس گناہ کو سرِعام کرنے میں اُسکا ہاتھ

ہے۔

حسن بنگالی کے برے دنوں کا آغاز ہوا تھا۔اب جب کہ وہ گھر گرہستی والا ہو گیا تھا، گھر کے اخراجات بڑھ گئے تھے اور اُنہیں پورا کرنا اُسکی ذمہ واری تھی۔ وہ کئی جگہ نوکری مانگنے گیا۔ کسی نے بھی اُسے نوکر رکھنے پر رضامندی ظاہر نہیں کی۔ سب کو یہی لگنے لگا کہ جو اپنی گاڑی کا انجن بیچ کے کھا سکتا ہے وہ اُن کے مال کی کیا رکھوالی کرے گا۔ حالات ایسے ہو گئے کہ حسن بنگالی پائی پائی کا محتاج ہونے لگا۔ اُسکا نام پہلے سے ہی بدنام تھا۔ اب اس انجن والے قصے نے اُسے اپنے سماج کی نظروں میں زلیل وخوار کر کے رکھا تھا۔

جب اُسکے مالی حالات کافی خستہ ہو گئے اور گھر میں کھانے کے لالے پڑنے لگے تو ایک دن اُسنے رحیم لنگڑے کو اپنے گھر پر بلایا اور اُس سے کہا۔ ''تم کو میری بیوی جیسی لڑکی چاہے تھی نا؟''

''ہاں''

''تو سمجھ لو تمہاری مراد پوری ہو گئی۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں۔ تم چاہو تو اس سے نکاح کر سکتے ہو۔ اس کے عوض کیا تم مجھے ایک لاکھ روپے دے سکتے ہو؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنی بیوی کو طلاق کیوں دینا چاہتے ہو؟''

''تم تو جانتے ہی ہو کہ میری نوکری چلی گئی۔ کوئی مجھے کام دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میری بیوی ہوا کھا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُسے روٹی چاہے۔ جب میں اُسے دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتا تو وہ میرے ساتھ رہ کر کیا کرے گی۔ اسلئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرا بھلے ہی گھر اُجڑ جائے مگر اس کو دو وقت کی روٹی کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ یہ فیصلہ لیتے ہوئے مجھے دکھ تو ہو رہا ہے مگر سچائی کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا''

یہ دلیل سن کر رحیم لنگڑا فوراً ایک لاکھ دینے پر راضی ہوا۔ دو دن کے بعد حسن بنگالی نے اپنی بیوی کو طلاق دیکر جب رحیم لنگڑے کے ساتھ روانہ کیا تو اس فیصلے سے اُسکے سر پر گویا بجلی گر پڑی۔ اُسنے خشم ناک نظروں سے حسن بنگالی کی طرف دیکھا۔ حسن بنگالی اُسکی شعلہ بار نگاہوں کا سامنا نہ کر سکا۔ رحیم لنگڑا اُسے لے کر چلا گیا۔

رات کو جب حسن بنگالی اپنے بستر پر دراز ہوا تو چلتی فلم کی طرح ایک ایک واقعہ اُسکی آنکھوں

کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اُسنے حسینہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ بھلا کوئی شوہر اپنی بیوی کا اسطرح سودا کرتا ہے کیا۔ اُسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ رات بھر وہ انگاروں پر لوٹتا رہا۔ وہ صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا کہ کب سویرا ہو اور وہ حسینہ کے پاس جائے اور اُسے واپس لے آئے۔

سویرا ہوتے ہی وہ سارے پیسے لے کر گھر سے نکلا اور سیدھے رحیم لنگڑے کے گھر پر پہونچ گیا۔ وہاں پہونچ کر وہ اپنا من مسوس کر رہ گیا جب اُسنے حسینہ کو دروازے پر بیٹھے روتے ہوئے پایا۔ جونہی اُسکی نظر حسن بنگالی پر پڑی تو وہ اُسکی طرف لپکی اور اُسکا گریبان پکڑ کر چلاتے ہوئے بولی۔

''کیوں چھوڑ دیا تم نے مجھے؟ کیوں تو نے میرا سودا کیا۔ کیسے شوہر ہو تم؟ ارے میں نے تو تم پر اپنا دل و جان نثار کیا تھا، بدلے میں تم نے مجھے کیا دیا۔ بے وفائی، دھوکہ اور فریب۔ شاید تم بھول گئے عورت جسے ایکبار چاہتی ہے اُسے مرتے دم تک نہیں بھولتی۔''

وہ روتی رہی چلاتی رہی اور حسن بنگالی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔ جب اُسنے پوری طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال دی تو اُسنے بڑے ندامت بھرے انداز میں اُس سے کہا۔

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اپنے اس غلطی کو درست کرنے کے لئے میں رحیم لنگڑے کے سارے پیسے واپس لے کر آیا ہوں۔ میں آج ہی تمہیں اس سے خلاصی دلا دوں گا۔ چاہے اسکے لئے مجھے کوئی بھی حربہ استمال کیوں نہ کرنا پڑے''

ابھی انکی گفتگو چل ہی رہی تھی کہ رحیم لنگڑا باہر آ گیا۔ حسن بنگالی کو دیکھ کر پہلے تو وہ حیران و ششدر ہو کے رہ گیا، پھر اُسنے اپنی بھوئیں تان لیں اور درشت لہجے میں حسن بنگالی سے پوچھا۔ ''بنگالی تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں تمہارے پیسے تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔ میں اپنی بیوی کو واپس لے جانا چاہتا ہوں''

''تمہاری بیوی؟'' اُسنے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''کل رات میرا اسکے ساتھ نکاح ہوا ہے۔ یہ اب تمہاری نہیں بلکہ میری بیوی ہے۔ اب تم اسے لے جانا تو دور اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو میں اپنے پڑوسیوں کو آواز دوں گا۔ ایسے جوتے پڑیں گے کہ یہ جو

سر پر بچے کھچے بال ہیں نا یہ بھی اُڑ جائیں گے۔''

اُسکا اتنا ہی کہنا تھا کہ لوگ سچ مچ جمع ہونے لگے۔ حسن بنگالی نے بھاگنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ وہ وہاں سے بھاگا تو سیدھے پولیس تھانے جا پہونچا اور رحیم لنگڑے پر اپنی بیوی کو بھگانے کا الزام لگا کر رپوٹ درج کرائی۔ پولیس نے تفتیش شروع کی۔ معاملہ آپسی مصالحت سے سلجھ نہیں پایا سو پولیس نے اس کیس کو عدالت کے سپرد کر دیا۔ حسن بنگالی چاہتا بھی یہی تھا کہ معاملہ عدالت میں چلا جائے کیونکہ حسینہ اُسکے حق میں تھی اسلئے کیس کا فیصلہ اُسی کے حق میں جانے والا تھا۔

جب عدالت میں حسن بنگالی کو بلایا گیا تو وہ بڑا ابشاش اور پر اُمید نظر آ رہا تھا۔ جرح شروع ہوا۔ حسینہ کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ جج نے اُس سے پوچھا۔

''حسن بنگالی کہتا ہے کہ تم اُسکی منکوحہ ہو اور ملزم رحیم میر تمہیں بھگا کر لے گیا۔ رحیم لنگڑا کہتا ہے کہ اسکا نکاح تم سے ہوا ہے۔ سچ کیا ہے یہ تم ہی اس عدالت کو بتا سکتی ہو اور عدالت تم سے یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ تم کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ حسن بنگالی کے ساتھ یا رحیم لنگڑے کے ساتھ؟''

حسن بنگالی جانتا تھا کہ حسینہ کیا کہنے والی ہے اسلئے وہ پہلے سے ہی مونچھوں پر تاو دینے لگا۔ رحیم لنگڑا کسی حد تک گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ حسینہ نے پہلے رحیم لنگڑے کی طرف دیکھا۔ پھر حسن بنگالی کی طرف۔ وہ عجب کشمکش سے دوچار تھی۔ وہ کس کے حق میں فیصلہ سنا دے اور کس کے خلاف۔ یہ طے کرنا اُسے بڑا مشکل سا لگ رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ عدالت سے گویا ہوئی۔

''جج صاحب عورت بکاو چیز نہیں ہوتی۔ کہ جب کوئی چاہے اسے اپنا لے اور جب چاہے اسے بیچ ڈالے۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر سے پیار کرتی تھی۔ جب اُسنے میرا سودا کیا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ اس آدمی نے میرا سودا اس انسان سے کیا جو جسمانی طور پر معذور ہے مگر باغیرت ہے، بے غیرت نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایک بیوی کا وہ مقام اور مرتبہ دیا جسکی حقدار ایک بیوی ہوا کرتی ہے۔ اسلئے جج صاحب میں اسی آدمی کے ساتھ جانا چاہتی ہوں جو عورت کے جذبات اور احساسات کو سمجھتا ہے''

حسن بنگالی کو لگا جیسے حسینہ نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا بلکہ اُسے دار پر چڑھا دیا۔

☆☆

# گھر واپسی

پورے پانچ برس کے بعد جب چھبیل سنگھ اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ گھر لوٹا تو گھر کی حالت دیکھ کر اُسکی بیوی چھاتی پیٹ کر رونے لگی۔

''یہ ساڑھے کاردا کے حال ہو گیا ہے جی؟'' وہ سیاپا کرتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھنے لگی۔ چھبیل سنگھ نے اُسے سہارا دیکر سینے سے لگایا اور اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ واہگورو سب ٹھیک کرے گا۔''

پانچ برس پہلے وہ بھرا پرا گھر چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ آج وہ گھر ایسے ہی دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی مرا ہوا جانور جسکے اوپر گدھ ٹوٹ پڑے ہوں اور چھوڑ گئے ہوں خالی ہڈیوں کا پنجر۔ در و دیوار غائب ۔ اندر کے چھو کھٹے غائب۔ چھت کی آدھی ٹین غائب۔ حمام میں لگی تانبے کی مٹکی غائب۔ یہاں تک کہ بجلی کی تاروں کو بھی چور اُکھاڑ کر لے گئے تھے۔ آنگن میں جو خوبانیوں کے دو درخت تھے اُنہیں بھی کوئی اُپاڑ کے لے گیا تھا۔ بس ایک چار دیواری بچی تھی۔ اب جو دکھائی دے رہا تھا یہ گھر نہیں ایک کھنڈر تھا۔

چھبیل سنگھ کے لوٹ آنے پر آدھا گاؤں اُنکے سواگت کے لئے جمع ہو گیا تھا۔ وہ چھبیل سنگھ سے گلے مل کر رو رہے تھے۔ چھبیل سنگھ گھر لوٹ آنے کے احساس سے اتنا فرحاں و شاداں تھا کہ اُسے اس اُجڑے گھر کو دیکھ کر کوئی دکھ ہی نہیں ہو رہا تھا البتہ اُسکے پاس پڑوسی اپنے آپ کو شرمسار محسوس کر رہے تھے۔ ایک بزرگ نے آگے بڑھکر اُسکے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا ہوں چھبیلا کہ میں تمہاری جائیداد کی حفاظت نہ کر سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ایسے میں میں تمہاری جائیدا کی حفاظت کیسے کر پاتے۔ بڑی خوفناک آندھی چلی تھی۔ ایسی آندھی کہ لاکھ جتن کے باوجود کوئی بھی ایک دئے کو جلا کے نہ رکھ سکا۔ جب ہر طرف گھنگھور اندھیرا چھا جائے تو ایسے میں کہاں دکھائی دے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ زیادتیاں دونوں طرف سے ہوئیں۔ تم لوگوں کی جائیداد کو نقصان پہونچا، اُسکی بھرپائی تو ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو بہت کچھ کھو دیا جس کی بھرپائی بھی نہیں ہو سکتی۔ اب تم لوٹ کر آ گئے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم تمہارے

نقصان کی بھرپائی کریں گے۔ تم پھر سے اُسی طرح اس گھر میں رہو گے جس طرح تم پہلے رہا کرتے تھے۔"

چھبیل سنگھ بزرگ کے گلے سے لگ کر رو پڑا۔ پاس میں جو لوگ کھڑے تھے اُن کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

چھبیل سنگھ بڈگام کے اس چھوٹے سے گاؤں شوگہ پورہ میں اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کے پاس اچھی خاصی زمین جائیداد تھی۔ زمین کے علاوہ اُسکے پاس ایک ٹرک بھی تھا جسے وہ خود چلاتا تھا۔ اُسکا ایک پاؤں گھر میں اور ایک گھر سے باہر ہی رہتا تھا۔ کبھی وہ فروٹ لاد کے جموں چلا جاتا تھا تو کبھی دلی۔ اُسکی بیوی پرنیت کور آس اولاد والی تھی۔ اُسکے تین تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ وہ بڑی سگھڑ اور سمجھدار عورت تھی۔ اُسنے گھر کو ایسے سجا کے رکھا تھا کہ پڑوسیوں کو رشک ہونے لگتا تھا۔ چھبیل سنگھ اپنی بھاگ بھری پر ناز کرتا تھا۔ وہ گھر اُسکے بھروسے ہفتوں چھوڑ کے چلا جاتا تھا۔ کبھی پرنیت نے اُسے شکایت کو موقع نہ دیا۔ وہ اکیلے گھر کو ایسے سنبھال کے رکھتی تھی کہ چھبیل سنگھ کو گھر سے باہر رہ کر کبھی گھر کے بارے میں چنتا نہیں کرنی پڑتی تھی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ایسی آندھی چلی جس نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اقلیتی فرقے میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ حالات دن بہ دن ابتر ہونے لگے۔ ہر روز وارداتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ کبھی بم پھٹتے تھے۔ کبھی گولیاں چلتی تھیں۔ بے گناہ اور معصوم لوگ لقمہ اجل بنتے جا رہے تھے۔ چھبیل سنگھ کا کام ٹھپ ہو گیا۔ ٹرک گھر میں ہفتوں کھڑا رہا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے پہل تو لوگ امید فرداں کو لے کے جی رہے تھے۔ جب حالات انتہائی ابتر ہونے لگے تو دھیرے دھیرے ساری اُمیدیں، مایوسیوں میں بدل گئیں۔ لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی قوت ہی سلب ہو گئی۔ ہر کوئی بے بسی اور لاچارگی سے دیکھتا رہا۔ اقلیتی فرقے کے لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے اسلیئے وہ ہولے ہولے نقل مکانی کرنے لگے۔ چھبیل سنگھ کے کئی سکھ پڑوسی اپنا گھر بار چھوڑ کے جموں کوچ کر گئے تھے۔ چھبیل سنگھ گھر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ بار بار پرنیت کو دم دلاسہ دیتا رہتا تھا۔

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ واہگورو سب ٹھیک کر دیں گے۔"

اُسکے یہ سارے دم دلاسے اُسوقت بے سود ثابت ہوئے جب چھبیل سنگھ کے ایک رشتہ دار پرتھوی سنگھ کو دن دہاڑے بھرے بازار میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ وہ بھی ٹرک ڈرائیور تھا اور اُسنے جموں کا پھیرہ لگانے کی جرات کی تھی۔ پرتھوی سنگھ کی موت کی خبر سن کر چھبیل سنگھ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب اُس کے پاس پرنیت کور کو دلاسہ دینے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔ پرنیت کور اس قدر خوفزدہ تھی کہ وہ راتوں رات اپنے بچوں کو لے کر نکل جانا چاہتی تھی۔ چھبیل سنگھ تو عجب دھرم سنکٹ میں پڑ گیا تھا۔ اُسکے لئے تو آگے کھائی اور پیچھے کنواں تھا۔ وہ گھر میں رہے تو خطرہ، گھر چھوڑ کے چلا جائے تو پریشانی۔ وہ کرے تو کیا کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر پرنیت کور سر پڑ گئی تھی کہ وہ اُنہیں یہاں سے نکال دے۔

ایک رات پرنیت نے چھبیل سے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا۔

''ہون میرے سے اس کا روچ رہا نہیں جاندا۔ دیکھو جی جان ہے تو جہاں ہے۔ اگر اسی ہی نہیں رہے تو پھر یہ سب کچھ لے کے کی کرو گے۔''

چھبیل سنگھ نے محنت مزدوری کر کے بہت کچھ بنالیا تھا۔ اب اس سب کو چھوڑ چھاڑ کے جانا اُسے بڑا تکلیف دہ لگ رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے جانے کے بارے میں کسی سے زکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کسی پڑوسی کو اُسکے جانے کی بھنک بھی لگ جاتی تو کوئی اُسے گاؤں چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اُسنے پرنیت سے اپنے مال مویشی کا واسطہ دیا۔ پرنیت کہاں کچھ سننے والی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنے کہے کی تھی۔ اُسکی کوئی بھی بات پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔ جو فیصلہ وہ لیتی تھی اُسے بدلنا چھبیل سنگھ کے بس میں نہیں تھا۔ بڑی اڑیل عورت تھی۔ جب ضد پر آتی تھی تو دنیا چاہے ادھر سے اُدھر ہو جائے وہ اپنی ہٹ نہیں چھوڑتی تھی۔ بالآخر چھبیل سنگھ کو ہی جھک جانا پڑتا تھا۔ وہ اُسکی فطرت سے بھلی بھانتی واقف تھا۔

قادر چوپان گاؤں کا چرواہا تھا۔ وہ اس گاؤں کی مویشیاں چراتا تھا۔ یہی اُسکی روزی روٹی کا وسیلہ تھا۔ چھبیل سنگھ کی گائیں بھی وہی چرانے لے جاتا تھا۔ چھبیل سنگھ کے پاس اعلی نسل کی کئی جرسی گائیں تھیں جو دودھ دینے کے معاملے میں سب سے اول مانی جاتی تھیں اور جنہیں وہ جموں سے بڑے مہنگے داموں میں خرید کر لایا تھا۔ وہ انہیں خدا کے رحم کرم پر چھوڑ کے جانا نہیں چاہتا تھا اسلئے وہ رات کے وقت

قادر چوپان کے گھر چلا گیا اور اُسے باہر بلا کر بڑے رازدارانہ لہجے میں اُس سے کہا۔ ''تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔دن بہ دن حالات کیسے ابتر ہوئے جارہے ہیں۔اب ہم لوگوں کے لئے یہاں رہنا بڑا مشکل ہے۔ہم آج رات یہاں سے جارہے ہیں میں اپنے سارے مال مویشی تمہارے بھروسے چھوڑ کے جارہا ہوں۔جب تک ہم نہیں لوٹیں گے تم ان کی دیکھ بھال کروگے۔دیکھ میرے بھروسے کی لاج رکھنا۔''

چھبیل سنگھ کے جانے کی خبر سن کر قادر چوپان نے اوپری دل سے بڑا افسوس کیا اور وہ اُسے تسلی دیکر بولا۔

''جارہے ہو پر یہ سوچ کے جانا کہ تمہیں یہیں لوٹ کر آنا ہے۔جب تک تم نہیں لوٹو گے میں ان مویشیوں کو تمہاری امانت سمجھ کر پالوں گا البتہ دودھ کی میں کوئی گارنٹی نہیں دے پاؤں گا۔بس دودھ کا قرض معاف کر دینا۔'' یہ کہکر اُسنے اپنی بانہیں واکیں۔چھبیل سنگھ جذباتی ہو کر اُس سے لپٹ گیا اور بہت دیر تک وہ قادر چوپان سے لپٹ کر سبکتا رہا۔اُدھر پرنیت کور غصے سے اُبل رہی تھی۔وہ کب سے تیار بیٹھی تھی۔جونہی چھبیل سنگھ آ گیا تو وہ اُس پر چڑھ بیٹھی۔چھبیل سنگھ پر رقت طاری تھی وہ پرنیت سے کچھ نہیں بولا۔چپ چاپ بچوں کو لے کر وہ نیچے اُتر گیا۔پیچھے سے پرنیت کور چلی آئی۔وہ اپنے ساتھ بڑا سا بیگ اُٹھائے ہوئے تھی۔چھبیل سنگھ نے سارا سامان اپنے ٹرک میں ڈالا اور پھر ٹرک لے کے وہ رات کے اندھیارے کو چیرتے ہوئے چوروں کی طرح گاؤں سے نکل گئے۔

قادر چوپان سویرے سویرے ہی ڈنگر لے کر چلا گیا۔پاس پڑوسی جب گھر کے سامنے سے گزرنے لگے تو گھر میں سناٹا دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گئے۔جب دوپہر تک گھر کے اندر سے کوئی حرکت نہ ہوئی تو اُن کا ماتھا ٹھنکا۔پڑوسیوں نے ادھر اُدھر سونگھ سانگھ کے پتا لگا لیا تو معلوم پڑا کہ چھبیل سنگھ اپنے اہل و عیال کو لے کر ادھر سے چھومنتر ہو گیا ہے۔گاؤں میں طرح طرح کی چمیگوئیاں ہونے لگیں۔قیاس اور قافیوں کا دور شروع ہو گیا۔اٹکل باز،اٹکلیں لگانے میں جٹ گئے۔چھبیل سنگھ کی ہجرت باعث موضوع بنی رہی۔اس بیچ اُسکے گھر میں سیندھ لگنے لگی۔دھیرے دھیرے گھر کا سامان صاف ہونے لگا۔اب پاس پڑوس میں سے وہ کسی کو بول کے بھی نہیں گیا تھا کہ وہ اُس کے گھر کا خیال رکھے اسلیئے کوئی اُسکے مکان کے

آس پاس پھٹکا بھی نہیں، کہ مبادا کل کو کہیں چوری کا الزام اُس پر نہ لگے۔ زمینیں مزارعے کاشت کرتے رہے۔ وہ پہلے بھی چھبیل سنگھ کے یہاں کام کرتے تھے اسلیئے اُنہوں نے اُسکی زمینوں کو کاشت کرنے کا ذمہ خود ہی اُٹھالیا۔ حالات ایسے نہ تھے کہ کوئی جا کر اُنہیں ایسا کرنے سے روکتا۔ یہاں تو سب کے جان کے لالے پڑے تھے۔ لوگ اپنے سایے سے بھی خوف کھانے لگے تھے۔ ایسے میں کسی کو روک ٹوک کے اپنے سر کوئی آفت کیوں مول لیتا۔ اس طرح چھبیل سنگھ کی زمین پر کئی لوگوں کا قبضہ ہو گیا۔ چھبیل سنگھ کا تو کوئی اتا پتا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کو اتنی جانکاری ملی تھی کہ وہ جموں کے کسی کواٹر میں اپنے بچوں کو لے کر پڑا ہے۔

ان پانچ برسوں میں وہ گھر لوٹنے کے لئے کتنا ترسا، کتنا تڑپا یہ چھبیل سنگھ ہی جانتا تھا۔ جب بھی وہ لوٹنے کا فیصلہ کرتا تھا کوئی نہ کوئی انہونی اُسکے بڑھتے قدموں کو روک دیتی تھی۔ وہ پانچ برس تک بن آب مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ جب بھی اُسے اپنا گھر یاد آتا تھا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ ان پانچ برسوں میں وہ کافی کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ کھانے پینے میں پرنیت کوئی کمی کسر نہیں رکھتی تھی مگر اُجلی گزراں کے باوجود اُسکے احساس میں کوئی ایسی پھانس اُٹکی ہوئی تھی جو جب بھی ہلتی تھی تو اُسے لہولہو کر دیتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خالی جسم لے کے گھوم رہا ہو۔ روح جیسے وہ اپنے گھر میں ہی چھوڑ کر آ گیا ہو۔

اب جب کہ وہ پانچ برس کے بعد اپنے گھر لوٹا تھا تو مارے خوشی کے اُسکے پاؤں زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ اُسے یہاں کے زرے زرے میں وہی پیار اور خلوص نظر آ رہا تھا جو اس وادی کا خاصا رہا ہے۔ وہ کتنے برسوں کے بعد اپنوں سے ملا تھا۔ وہ مسلمان پڑوسی جنہیں وہ سچے معنوں میں اپنا سمجھتا تھا۔ اُسکے لوٹ آنے پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اُسکے آنے سے تو گاؤں میں جشن کا سا ماحول تھا۔ کہاں کہاں سے اُسکے جاننے پہچاننے والے اُس سے ملنے چلے آ رہے تھے۔ وہ اتنا پیار پا کر نہال ہوا جا رہا تھا۔

ایکطرف چھبیل سنگھ اپنے یار دوستوں سے خوش گپیاں کر رہا تھا تو دوسری طرف پرنیت جس سے بھی ملتی اُسے اپنا جھینکا سنانے بیٹھ جاتی تھی۔ اُن ملنے جلنے والوں میں قادر چوپان بھی تھا جو جب چھبیل

مویشیوں کا حساب مانگ رہی ہے۔ اگر اُنہیں پتا چلا کہ اُنکے مویشی مرے نہیں بلکہ اُن میں سے آدھے ہم نے بیچے ہیں اور ایک ہم نے رکھ لی ہے تو سوچو میرا حشر کیا ہوگا۔ ایسا کرو تم رات کو اس گائے کو لے کر اپنے ماموں کے یہاں چلے جاو۔"

"ماموں کے یہاں لے جا کر کیا ہوگا۔ اگر وہ وہاں سے بھاگ کر آ گئی تو پھر کیا کرو گے۔ میری مانو ہم آج رات اس گائے کو ذبح کر دیں گے۔ نہ بجے گا بانس نہ رہے گی بانسری۔ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ ویسے بھی گاؤں میں گوشت کی کافی قلت پڑی ہے۔ مر کے بھی وہ گائے ہمیں بہت کچھ دے کے جائے گی"

"یہ تم کیسی بات کرتے ہو۔ دودھیلی گائے کو بھی بھلا کوئی ذبح کرتا ہے کیا۔ ارے ایسی گائے آج تمہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ عمدہ نسل کی گائے ہے یہ۔ نہیں نہیں میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ پڑ جاو قانونی رگڑے جھگڑے میں۔ پولیس والوں کو تو لوٹنے کے لئے بس ایک بہانہ چاہیے۔ کرتے رہو پولیس والوں کی بندگی۔ کھاتے رہو اُنکے ڈنڈے۔ اب بھی موقع ہے، اس قصے کو یہیں پر ختم کرو۔ ایسا نہ ہو کہ سانپ نکل جائے اور تم بس لکیریں ہی پیٹتے رہ جاو گے"

قادر گومگو کی حالت میں پڑ گیا۔ وہ رفیق کی بات نہ مانے تو اُسکا بھانڈہ کبھی بھی پھوٹ سکتا تھا۔ اُسکی یہی بھوری گائے اُسکا بھانڈہ پھوڑ سکتی تھی کیونکہ اُسے جب بھی موقع ملتا تھا وہ چھبیل سنگھ کے گھر کا طواف کر کے آتی تھی۔ چھبیل سنگھ اور پرنیت اُسے جھٹ سے پہچان سکتے تھے اور قادر کے جھوٹ کی قلعی اُسی کے ساتھ کھل سکتی تھی اسلئے اُس نے رفیق کے فیصلے سے ہی صاد کرنا بہتر سمجھا۔ اُسنے ایک لمبی سے رسی نکالی اور رفیق کو چھری لانے کے لئے کہدیا۔ دونوں باپ بیٹے آ کھر میں چوروں کی طرح گھس گئے۔ قادر نے گائے کے پاؤں میں اس طرح رسی پھنسا دی کی وہ دھڑام سے نیچے گری اور رفیق چھری لے کر اُسے ذبح کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے کہ چھری گائے کی گردن پر چل جاتی رحتی بھاگ کر نیچے آئی۔ وہ کافی بدحواس تھی۔ اُسنے کپکپاتی آواز میں قادر سے کہا۔ "پولیس ادھر کو ہی آ رہی ہے۔" باپ بیٹے نے سارا

سامان وہیں پھینک دیا اور وہ پچھلے دروازے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس ہڑبڑاہٹ میں وہ گائے کو باندھنا بھول گئے۔ گائے نے موقع غنیمت جانا۔ وہ رسّی کو سینگوں سے پرے دھکیل کر جارحانہ انداز میں نکل گئی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اُسے ذبح کرنے والے تھے۔ رسّی جن پولیس والوں کو آتے دیکھ کر اس قدر ڈر گئی تھی وہ اُنکے گھر میں نہیں بلکہ اُنہی کے پڑوسی کے یہاں چوری کی تحقیقات کرنے آئے تھے۔ اب اس غلط فہمی میں بھوری کی جان بچ گئی۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنے پرانے ٹھکانے پر پہونچ گئی۔ جب اُسنے چھبیل اور پرنیت کو صحن میں بیٹھے دیکھا تو اُنہیں دیکھ کر وہ کدکڑے مارنے لگی۔ اپنی دم اُٹھائے وہ بہت دیر تک آنگن میں ناچتی رہی پھر آکر وہ پرنیت اور چھبیل کو چاٹنے لگی۔ پرنیت نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اُسکے گلے سے لگ کر مارے خوشی کے رو پڑی۔ چھبیل ششدر ہو کے کھڑا تھا۔ اب وہ پرنیت سے آنکھیں بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قادر نے اُس کے ساتھ بے ایمانی کی ہے پر اُسے خجالت سے بچانے کے لئے وہ اس معاملے کو ٹالتا جا رہا تھا۔ اتنے میں قادر بھی گائے کے پیچھے چلا آیا۔ اب کے چھبیل سنگھ نے میان سے کرپال نکالی۔ قادر کرپان دیکھ کر سر سے پاؤں تک لرز کے رہ گیا۔ اُسکی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ چھبیل سنگھ نے کرپان اُسکی طرف بڑھا کر کہا۔

''تو اس کرپان سے میرے دو ٹکڑے کر۔ واہگورو دی سوں مینوں کوئی تکلیف نہیں ہوگی مگر جس طرح تو نے میرے نال بے ایمانی کی ہے۔ جسطرح تو نے میرا بھروسہ توڑا، اُسکے لئے میں تینوں کدی معاف نہیں کر سکدا۔ مینوں پہلے دن سے ہی پتا تھا کہ تو نے میرے نال دھوکہ کیا ہے۔ میں بس تینوں خجل ہونے سے بچا رہا تھا۔ تو نہیں جاندا ہے کہ وشواس گھات کرنا کنا وڑا جرم ہے۔ اسکے لئے واہگورو تینوں کدی معاف نہیں کرے گا۔''

قادر کو لگ رہا تھا جیسے وہ زمین میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہو۔ وہ چھبیل سنگھ کا سامنا نہیں کر پایا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ اُسکا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا تھا۔ وہ چھبیل سنگھ کی عظمت کے آگے اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔

☆☆

# جہلم کی واپسی

ماتاہری کو دریائے جہلم کے تئیں بے پناہ عقیدت تھی۔ اُسکا ماننا تھا کہ اس دریا کا ناتا سیدھے سورگ لوک سے ہے۔ وہ ہر سال امرتسر سے ایک جتھالے کے کشمیر آجایا کرتی تھیں اور سیدھے شادی پور جاکے ڈیرہ ڈال لیا کرتی تھیں۔ شادی پور وہ مخصوص جگہ تھی جہاں کشمیری ہندو مردوں کے شرادھ کیا کرتے تھے یا اُنکی استھیاں بہایا کرتے تھے۔ ماتاہری اپنے ساتھ بہت سارے مردوں کی استھیاں لے کر آتی تھیں اور یہاں شادی پور کے گھاٹ پر وہ ان استھیاں کو بہادیا کرتی تھیں۔ وہ ہفتوں یہاں بیٹھ کے اُن مرے ہوئے لوگوں کی آتما کی شانتی کے لئے پوجا پاٹھ اور یگیہ کیا کرتی تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جن لوگوں کو جانتی تک نہیں تھیں وہ اُنکی مکتی کے لئے پوجا پاٹھ کیا کرتی تھیں۔ اصل میں ہوتا کیا تھا کہ امرتسر کے غریب غربا جن کی حثیت اپنے رشتے ناتے داروں کی استھیاں ہردوار جا کر گنگا میں بہانے کی نہیں ہوتی تھیں وہ استھیوں کے یہ کلش ماتاہری کے متھے ماردیتے تھے۔ ماتاہری کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ان استھیوں کو ٹھکانے لگادے۔ ماتاہری ایک سادھوی تھیں جس نے سنسار کے موہ مایا سے کنارہ کر کے اپنے آپ کو دھرم کرم کے کاموں میں لگا دیا تھا۔ وہ کسی لوبھ لالچ یا نام ونمود کے لئے یہ دھارمک کاریہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ یہ کام اسلئے کرتی تھیں کیونکہ ایسا کرنے سے اُسکی آتما کو بڑی خوشی اور شانتی مل جاتی تھی۔ چونکہ اُسے جہلم کے ساتھ ایک جذباتی لگاوتھا اسلئے جب بھی وہ کشمیر جانے کا پروگرام بنالیتی تھیں تو اس یاترا سے پہلے اُورے دھورے میں یہ خبر پھیلادی جاتی تھی کہ ماتاہری کشمیر کی یاترا پر جارہی ہیں تو بہت سارے سوگوار پریوار نہ صرف اُس کے درشن کرنے آجاتے تھے بلکہ اپنے مرے ہوئے لوگوں کی استھیاں بھی اُنہیں سونپ کر چلے جاتے تھے۔

شادی پورہ آکے اُسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے گھر آگئی ہوں۔ یہاں آکے اُسے بڑا سکون ملتا

تھا۔ وہ جب جہلم کو اپنی چوڑی چکلی چھاتی پھیلائے ہوئے بڑے شان سے رواں دواں دیکھتی تھیں تو اُسکی باچھیں کھل جایا کرتی تھیں۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے یہ جہلم اُسکا بالک ہو اور وہ اسکی ماں ہو۔ جب وہ اشنان کرنے کے لئے پانی میں اُتر جاتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ نہا نہیں رہی ہو بلکہ اپنے بالک کو سینے سے لگا کر پیار کر رہی ہو جو ہمک کر اُسکی گود میں آ گیا ہو۔ ایسا پیار اور لگاؤ تھا اُسے اس جوئے بار کے ساتھ۔

ماتا ہری ساٹھے پاٹھے میں ہو کر بھی جوان لگتی تھیں۔ اُسکی جوانی کا راز اس بات میں مضمر تھا کہ وہ ہر دم اپنے مالک سے لو لگائے بیٹھی رہتی تھیں۔ جب دیکھو وہ مراقبے میں نظر آتی تھیں۔ وہ پوجا ارچنا میں ایسی لین رہتی تھیں کہ اُسے کھانے پینے کی سدھ بھی نہیں رہتی تھی۔ اُسنے مادی خواہشوں کو تلانجلی دے کے رکھی تھی۔ گیروے کپڑے کے دو جوڑے اُسکی کل پونجی تھی۔ ایک میلا ہوتا تھا تو دوسرا پہن لیتی تھیں۔ کھانے پینے میں بھی وہ بخل سے کام لیتی تھیں۔ دو نوالوں سے ہی اُسکا پیٹ بھر جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہفتوں بھوکی رہ سکتی تھیں۔ اُسکے لئے ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ اُسکے جتھے میں جتنے بھی لوگ شامل تھے یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جوگ سادھ لیا تھا۔ اُنہیں تو بس ماتا کی سیوا کرنے میں آنند مل رہا تھا۔ ماتا ہری بلاشبہ سادگی پسند تھی مگر اُسکا طنطنہ ایسا تھا کہ لوگ اُسکے قریب جانے میں بھی خوف کھاتے تھے۔ اُسکے اگل بغل میں دو رکھشک ہر دم اُسکے ساتھ ساتھ چلتے رہتے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ محافظ نہ ہوں بلکہ ندی کے دو پاٹ ہوں جو دریا کے بہاؤ کو دونوں اطراف سے تھامے بیٹھے ہوں۔ وہ ان دو پاٹوں کے بیچ بڑے شاہانہ اور پروقار انداز میں یوں چلتی تھی جیسے یہ ماتا ہری نہ ہو بلکہ ایک وشال نہر ہو جو پروقار انداز میں اپنی چوڑی چکلی چھاتی پھیلائے شان بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہو۔

ماتا ہری لوگوں کی بے غرض سیوا کرتی تھیں۔ کسی سے کچھ لینا تو دور وہ کسی کے ہاتھ سے دو گھونٹ پانی بھی نہیں پیتی تھیں۔ اُسکا کہنا تھا کہ وہ کسی کی سیوا کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر کیوں جئے۔ کوئی اگر ماتا کے لئے پھل فروٹ لے کر آ جاتا تھا تو ماتا اُنہیں چکھتی تک نہیں تھی بلکہ یہ سارے پھل اُسی وقت بھگتوں میں بانٹ لیا کرتی تھیں۔ ماتا نے بڑا وشال دل پایا تھا۔ اُسکے ہاتھ ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جو بھی اُسکے درشن کرنے آ جاتا تھا وہ اُسے خالی ہاتھ نہیں لوٹا دیتی تھیں۔ جو بھی اُسکے پاس دھیلہ دمڑی ہوتا تھا وہ اپنے ان

بھگتوں کی جھولی میں ڈال لیا کرتی تھیں۔

وہ امرتسر لوٹنے سے پہلے چند روز ہمارے گاوں آکر گزار لیا کرتی تھیں۔ اُس کی آمد سے پہلے جل کے دو بڑے بڑے کنستر ہمارے گاوں میں پہونچ جایا کرتے تھے۔ یہ جل گنگا کا جل نہیں ہوتا تھا بلکہ جہلم کا پانی ہوتا تھا جو اس بات کی آگہی ہوتی تھی کہ ماتا ہری کی آمد آمد ہے۔ گاوں پہونچ کر جو بھی اُس سے ملنے آتا تھا تو وہ دوڑ کر ماتا کے پاوں چھونے کی کوشش کرتا۔ ماتا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ پاوں چھونے والے کو پہلے ڈانٹ کر دور بھگایا کرتی تھیں۔ پھر اُسے بڑے پیار سے اپنے پاس بلا کر سمجھا دیتی تھیں کہ کسی غیر کے پاوں چھونا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر پاوں ہی چھونے ہیں تو بے شک اپنے ماں باپ کے پاوں چھوا کرو۔ وہ اسلئے کہ اس سنسار میں اولاد کے لئے ماں باپ سے بڑھکر کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ اُنکے جنم داتا ہیں اور جنم داتا بہت ہی مہان ہوتا ہے۔ جیسے اس سنسار کا جنم داتا۔ اُسکے بعد ماتا کے پاس جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ بھگتوں میں دل کھول کے بانٹ لیا کرتی تھی۔ ماتا کسی بھید بھاو یا چھوا چھوت کو نہیں مانتی تھیں۔ اُسکے لئے نہ کوئی غیر تھا نہ اپنا۔ اُسکے لئے تو سب یکساں تھے وہ چاہے غریب ہو یا امیر۔ وہ چاہے شودر ہو یا برہمن۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ ماتا ہری پاپیوں کے پاپ اپنی میٹھی وانی اور جہلم کے شیتل جل سے دھو لیا کرتی تھیں۔ اُسکے لئے جہلم کا جل گنگا جل سے کم نہیں تھا۔ وہ مرجھائے ہوئے دلوں میں اُمنگ کے نئی کلیاں کھلا کر جاتی تھیں۔ اُسکی وانی میں اثر تھا۔ اُسکی دعاوں میں تاثیر تھی۔ وہ سچ مچ سخی اور دانی تھی۔

ماتا ہری بھگوان کے سوا اگر کسی اور کے آگے جھکتی تھیں تو وہ تھا دریا جہلم۔ کئی لوگوں نے یہ جاننے کی کئی مرتبہ کوشش کی کہ آخر جہلم میں ایسی کیا بات ہے جو ماتا ہری جہلم کے آگے اپنا سر جھکاتی ہے۔ ماتا ہری بولتی بہت کم تھیں۔ لوگ اُس سے سوال کرنے سے بھی گھبراتے تھے۔ یہ سوچکر کہ کہیں ماتا کا دماغ اگر پھر گیا اور اُسکے منہ سے کوئی اُلٹا سیدھا شبد نکل گیا تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ اکیسویں صدی میں پاوں پسارنے کے باوجود اس ملک میں توہم پرستی کا رجحان آج بھی کم نہیں ہوا ہے۔ لوگ آج بھی سادھو سنتوں کو ایک خاص مخلوق سمجھتے ہیں اور اُن کی روحانی طاقت کو جانچے پرکھے بنا وہ یونہی اُنکے قائل ہو جاتے ہیں اور اُنکے قہر سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ ماتا ہری عام سادھو سنتوں سے بالکل الگ تھیں۔ اُنہیں اول تو

غصہ کبھی آتا نہیں تھا۔ اگر خدانخواستہ کبھی غصہ آ بھی گیا تو ایسی گھڑی میں وہ ایک دم خاموش ہو جاتی تھیں۔ اُنکی خاموشی اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ ماتا اس وقت غصے کے عالم میں ہیں۔ اپنے من کو شانت کرنے کے لئے تو وہ جہلم کے کنارے پر بیٹھ کر گھٹنوں آسن جما کر بیٹھا کرتی تھیں۔ جب من کچھ شانت ہو جاتا تھا تو وہ جہلم میں اُتر جاتی تھیں اور تب تک پانی میں ڈبکیاں لگاتی رہتی تھیں جب تک رات سے صبح نہیں ہو جاتی تھی۔

دریا جہلم اور ماتا ہری میں کچھ باتیں یکساں تھیں۔ ماتا ہری کی طرح جہلم بھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔ وہ اپنے دو دو ہاتھوں سے لوگوں میں امرت بانٹتا رہتا تھا۔ ماتا ہری اور جہلم کی کہانی ایک جیسی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ماتا ہری کہاں اور کب پیدا ہوئی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا جہلم کب اور کیسے پیدا ہوا البتہ جہلم کے بارے میں میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جہلم ویری ناگ کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ صدیوں سے وہ اسی کوکھ سے امرت کی دھارا بن کر آگے بڑھتا ہے اور پھر پہاڑوں سے اُتر کر سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر، میدانوں کو چیر کر آگے بڑھتا ہے۔ کہیں بید کے سایہ دار اشجار سے اٹھکلیاں کرتے ہوئے، تو کہیں سیب کے باغوں سے بوس و کنار ہوتے ہوئے تو کہیں اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں میں اپنے بدن کو سہلاتے ہوئے، تو کہیں سفیدے کے اونچے پیڑوں کو چڑاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف چل پڑتا ہے۔ ہم لوگوں نے اس سے کیا کیا کام نہیں لیا۔ ہم نے جب جنگلوں کو کاٹنا شروع کیا تو شہتیریں اور موٹے موٹے گیل شہر تک پہونچانے کے لئے ہم نے جہلم کا سہارا لیا۔ وہ ان شہتیروں اور لٹھوں کو اپنے سینے پر اُٹھائے چلتا رہا۔ کہیں مال برداری کے لئے ہم نے ڈونگے اور کشتیوں کو اُسکی چھاتی پر سوار کر دیا۔ یہ ڈونگے اور کشتیاں بڑے اطمینان سے جہلم کے پانیوں پر تیرتی رہیں۔ میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں جب اتنے سارے پل نہ بنے تھے۔ جب کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے لئے کشتیوں کی سواری کرنی پڑتی تھی۔ سڑکیں بھی اتنی نہ تھیں اسلئے مال برداری کے لئے ڈونگوں کا استعمال ہوتا تھا جو اسی جہلم کے پانیوں پر سوار ہو کے چلتے تھے۔ اتنے سارے کام کرنے کے باوجود نہ کوئی غصہ، نہ بیزاری۔ نہ کوئی تھکاوٹ نہ ملال۔

جہلم نے اس وادی کو کیا کچھ نہیں دیا۔ اُفتادہ پڑی زمینوں کو اپنے امرت سے آباد کیا۔ ویرانوں میں پھول کھلائے۔ دھرتی پر ہریالی لائی۔ اسنے نہ صرف پیاسوں کی پیاس بجھائی بلکہ صدیوں سے ہمارا میل دھوتا رہا۔ مجھے یاد ہے جب شہر میں نلکے نہیں لگے تھے تو لوگ جہلم کے اسی پانی سے سارے کام چلاتے تھے۔ تب یہ پانی امرت کی طرح شدھ اور شیتل ہوا کرتا تھا۔ کسی قسم کی غلاظت یا کثافت اس پانی میں نہیں پائی جاتی تھی۔ گاوں ہوں یا شہر، ہر جگہ پنگھٹ بنے ہوئے تھے جن پر ہر دم رونق لگی رہتی تھی۔ چنچل حسینائیں اپنے اپنے سروں پر گھاگرے یا مٹی کے مٹکے اُٹھائے خرام ناز کے ساتھ پانی لینے کے لئے انہی پنگھٹوں پر آجایا کرتی تھیں۔ اپنے مٹکے پانی پر لہراتے ہوئے جب وہ اپنی چوڑیاں کھنکانے لگتی تھیں تو انکی دلبرانہ اداوں اور چوڑیوں کی کھنک سے جہلم بھی جھومنے لگتا تھا۔

ماتاہری جہلم کی روانی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو پھلتے پھولتے دیکھ کر واری صدقے ہو جاتی ہے اسی طرح ماتاہری بھی جہلم کو پھلتے پھولتے دیکھ کر باغ باغ ہونے لگتی تھیں۔ وہ اس دریا کو بڑا پاک اور متبرک مانتی تھیں کیونکہ یہ دریا بغیر کسی صلے کے امرت بانٹ رہا تھا۔ بھٹکی آتماوں کو اُنکی آخری منزل تک پہونچاتا تھا۔ ماتاہری یونہی جہلم کی دیوانی نہیں تھیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ آدمی تبھی مکھش پا سکتا ہے جب جہلم اُسکی استھیوں کو قبول کرلے۔ اسی لئے تو وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتی تھیں کہ اس دریا کا ناتا سیدھے سورگ لوک سے ہے۔

ماتاہری اور جہلم کا یہ رشتہ برسوں تک یونہی چلتا رہا۔ اچانک کشمیر کے حالات بگڑ گئے۔ جہاں امن وامان تھا۔ جہاں سکھ وشانتی تھی وہاں پر بندوقیں دندنانے لگیں۔ فضا میں بارود کی بو ایسے پھیل گئی کہ سارا ماحول آلودہ ہو گیا۔ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ حالات ایسے ابتر ہو گئے کہ جو بھی گھر سے نکلتا تھا سر پر کفن باندھ کر نکلتا تھا۔ اُسکے زندہ لوٹ آنے کی گارنٹی بہت کم ہوتی تھی۔ شہر جیسے شہر خموشاں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جو شہر سیاحوں سے گلزار نظر آتا تھا اب وہی شہر جنگ کے اکھاڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ باہر کے لوگ اب وادی میں خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ایسے حالات میں ماتاہری کا آنا کہاں ممکن تھا۔ وہ اپنے جہلم سے ملنے کے لئے ترستی رہی مگر کشمیر میں جسطرح کی جنگ جاری وساری تھی، ایسے میں اُسکا آنا کہاں ممکن تھا۔ وہ

تو چاہتی تھیں کہ وہ کشمیر ہو کے آئے مگر اُسکے بھگت اُسکی جان جھوکھم میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان سب لوگوں کے منع کرنے کے باعث وہ چاہ کر بھی کشمیر آنہ سکی۔ دل میں یہ کسک لئے وہ برسوں تڑپتی رہی۔ کوئی سبیل کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اُسکا من کرر ہا تھا کہ وہ ایکبار پھر اُسی چاؤ سے کشمیر آئے اور شادی پور میں بیٹھ کر جہلم سے جی بھر کے باتیں کر سکے۔ اُسکے امرت جیسے پانی سے اپنے تن اور من کو سیراب کر سکے۔ وہ دن گنتی رہی مگر وقت تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جار ہا تھا۔ بھگتوں نے سمجھاو پیش کیا کہ وہ اگر چاہے تو اپنے کاریہ کو گنگا جا کر بھی پورا کر سکتی ہیں۔ وہ چاہتی تو گنگا گھاٹ جا کر اپنی مراد پوری کر سکتی تھیں مگر وہ تو جہلم کی دیوانی تھی۔ وہ اسی دریا سے مانوس تھی۔ وہ بلا کہیں اور کیسے جا سکتی تھیں۔ اسلیئے اُس نے سبھی سجھاو ٹھکرا دئے اور حالات سدھرنے کا بے صبری سے انتظار کرتی رہی۔

انتظار کرتے کرتے بیس سال گزر گئے۔ بالآخر جدائی کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ حالات میں بہتری آتے ہی ماتا نے پر تولنے شروع کئے۔ اُسنے بغیر کسی تامل کے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس بار وہ بہت بڑا جتھا لے کر نہیں آئی بلکہ چنیندہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ وہ سیدھے شادی پور چلے گئے۔ شادی پور پہونچ کر جو نظارہ ماتا ہری نے دیکھا اُسے دیکھ کر اُسکا کلیجہ پھٹ پڑا۔ جہلم تو کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تو کہیں غائب ہو چکا تھا اور اُسکی جگہ ایک گندا نالہ نظر آرہا تھا جو کسی مریل، مدقوق آدمی کی طرح کشاں کشاں چل رہا تھا۔ جہلم ایک گندے نالے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ امرت سے لبالب جہلم تو اب بول براز کو ڈھور ہا تھا۔ امرت تو کہیں تھا ہی نہیں۔ ماتا ہری جہلم کی یہ حالت دیکھ کر اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے جہلم ایک بیمار کی طرح ہو جو اپنے بدن سے پیپ اُگل رہا ہو۔ وہ جہلم کے کنارے بیٹھ کر اپنی چھاتی پیٹنے لگی اور ساتھ میں آٹھ آٹھ آنسو بہانے لگی۔ من یہ نظارہ دیکھ کر اتنا گھائل ہوا تھا کہ وہ رات بھر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ اُسنے ساری رات رو رو کر کاٹی۔ صبح جب وہ رودھو کے اُٹھی تو اُسکا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اُسکی غضب ناک صورت دیکھ کر اُسکے چیلے بھی سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اُسنے اپنے چیلوں کو حکم دیا کہ وہ ابھی اپنا سامان سمیٹ لیں اور واپس جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ سبھی ماتا کے اس فیصلے سے حیران تھے۔ ماتا جو جہلم کے درشن کرنے کے لئے مری جارہی تھی اب اسی جہلم سے دور بھاگ رہی تھیں۔ ماتا

ہری کا ہر حکم، حکم الٰہی کی طرح ہوتا تھا۔ اُسکے چیلوں نے سامان سمیٹ کر چلنے کی تیاری کی۔ جب وہ جانے لگے تو ماتا چلتے چلتے یکبارگی رکی اور پھر ٹکٹکی باندھے جہلم کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے ایک ماں اپنے بچے کو آخری بار دیکھ رہی ہو جو قریب المرگ ہو۔ اُسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔ دفعتاً اُسکے گال غصے سے تمتمانے لگے۔ اُسنے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا لئے اور پھر وہ اس وادی کو شراپ دے کے چلی گئی۔

ماتا ہری کا غصہ واجب تھا۔ پچھلی کئی دہائیوں سے جہلم کے ساتھ جسطرح کا استحصال ہوا تھا اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جن جنگلوں سے اُسے جیون کا رس ملتا تھا، ہم نے اُن جنگلوں کا صفایا کر دیا تھا۔ جسکی وجہ سے جو چھوٹے چھوٹے ندی نالے اُس سے مل جایا کرتے تھے، اُنکے سوتے سوکھ چکے تھے۔ جب جہلم کی سطح کم ہونے لگی تو وہ سکڑنے لگا۔ لوگوں نے اُسکے بدن کو نوچنا کھوسوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ جہلم نہ ہو ایک مردار جانور ہو جس پر گدھ ٹوٹ پڑے ہوں۔ اس جہلم کے کناروں پر گھر بننے لگے۔ ستم در ستم یہ کہ شہر کا سارا بول براز اُس کے منہ میں ڈالا گیا۔ جو دریا ہمیں آبِ حیات پلاتا تھا ہم نے اُسے زہر ہلاہل پلا دیا۔ اس تذلیل اور بے حرمتی سے وہ اندر ہی اندر گھٹتا چلا گیا۔ اُسکا پرسان حال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ جنتا نہ سرکار۔ سبھی تو اس لوٹ میں شامل تھے ایسے میں جہلم کے لئے کون آواز اُٹھاتا۔ وہ ایک نہیں ہزار موت مرا۔ اب اُسمیں امرت نہیں بہتا تھا بلکہ زہر بہتا تھا۔ وہ اب شہتیریں نہیں ڈھوتا تھا بلکہ انسانی لاشیں، یا مردار جانور ڈھوتا رہتا تھا۔ اب نہ وہ گھاٹ کہیں دکھائی دے رہے تھے جن پر ہر دم رونق لگی رہتی تھی اور نہ ہی وہ رنگین کشتیاں نظر آ رہی تھیں جو اسکے پانیوں پر لہراتی نظر آتی تھیں۔ اب تو اسکے کناروں پر لوگوں نے اپنے آشیانے بنالئے تھے۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ سب کچھ تحس نحس ہو چکا تھا۔ ماتا ہری کا دل یہی نظارہ دیکھ کر ٹوٹ چکا تھا اسی لئے وہ اس وادی کو شراپ دے کر چلی گئی تھیں۔

ماتا کا شراپ اکارت نہ گیا۔ ستمبر کے مہینے میں جب گرمی کے قہر سے سارا شہر تراہ تراہ کر رہا تھا کہ اچانک موسم کا مزاج بدل گیا اور کشمیر میں مینہ برسنے لگا۔ لوگ اسے رحمت باراں سمجھ کر خوشیاں منانے لگے۔ چار پانچ روز تک متواتر بارش ہوتی رہی۔ بارش بھی ایسی کہ ایک جیسے آسمان میں چھید ہو گیا ہو۔ ایک پل کے لئے بھی بارش تھمی نہیں۔ اُسکے بعد جو کچھ ہوا وہ دیدنی نہ شنیدنی تھا۔ وہ جہلم جو ایک مریل انسان کی

طرح ہو گیا تھا ایک سوئے ہوئے راکھشش کی طرح جیسے گہری نیند سے جاگ گیا اور پھر ایک بدمست ہاتھی کی طرح چنگھاڑنے لگا۔۔ جہلم میں لبالب پانی بھر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے گندے بدن کو پاک وصاف کرنے کے لئے رگڑ رگڑ کے نہار ہا ہو۔ جب اتنے سے بھی من شانت نہ ہوا تو پانی اپنے ہی کنارے کاٹ کر باہر آنے لگا۔ جہلم کے تیور دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے اس بار وہ یہ تہیہ کر کے آیا ہو کہ وہ اُن سب لوگوں کو سبق سکھائے گا جنہوں نے اُسکے بدن کو نجس و ناپاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اُسنے ایسا ہی کیا۔ وہ ایک بدمست ہاتھی کی طرح سب کچھ روندتے وئے چلا گیا۔ کوئی باندھ کوئی دیوار اُسے روک نہیں پایا۔ اُسکے سامنے جو آیا وہ اُسے خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ جنہوں نے بڑے ارمانوں سے اپنے گھر بنائے تھے۔ اُسنے اُن مکانوں پر ایسے یلغار کر دیا کہ وہ گھر تاش کے پتوں کی طرح ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ جن کے گھروں میں لاکھوں روپے کا سامان پڑا تھا اُسنے اُس سامان کو تحس نحس کر کے رکھ دیا۔ اُسنے کسی کو نہیں بخشا۔ لاکھوں کے گھر خاک ہو کے رہ گئے۔ بچوں کے سپنے بکھر گئے۔ کنواریوں کے ارمان مٹی میں مل کر رہ گئے۔ کچھ بھی نہیں چھوڑا اُسنے۔ کسی پر اُسنے کوئی دیا نہ کی۔ کسی پر اُسے ترس نہیں آیا۔ جو غلاظت وہ برسوں سے ڈھوئے جا رہا تھا اُسنے وہی غلاظت لوگوں کے قیمتی غالیچوں پر بکھیر دی۔ سجے سجائے ڈرائنگ روموں میں پھیلا دی۔ باورچی خانوں میں پوت دی۔

ماتا ہری کا بالک آج پھر پہلے والے روپ میں دکھائی دے رہے تھا۔ جہلم کا یہ روپ دیکھ کر کسی نے ماتا ہری کو خبر کر دی کہ وہ اب کے کشمیر کی یاترا پر ضرور آجائے۔ اُنہیں یقین تھا کہ جب ماتا ہری جہلم کا یہ روپ دیکھ لیں گی تو اُسکا کلیجہ باغ باغ ہو جائے گا۔ اُسکی آتما دھنیہ ہو جائے گی۔ ماتا ہری تک یہ پیغام پہونچا ضرور۔ دو تین روز کے بعد نارنجی کپڑے میں لپٹا ایک سنہری کلش شادی پور پہونچا۔ اس کلش میں ماتا ہری کی استھیاں تھیں۔ ماتا ہری اس سنسار کو الوداع کہہ چکی تھیں۔ جہلم نے شاید ماتا ہری کے لئے ہی اپنے بدن کو پاک وصاف کر کے رکھ دیا تھا تاکہ وہ ماتا ہری کی استھیاں سورگ لوک تک پہونچا سکے۔

☆☆

# جلوہ

میری دادی جب تک حیات تھیں وہ جوالا دیوی کا ہر سال درشن کرنے ضرور جایا کرتی تھیں۔
جوالا دیوی کا مندر سری نگر سے تیس پنتیس کلومیٹر دور کھریو کی پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ علاقہ اننت ناگ کے قصبے میں آتا ہے۔ دادی میرے لئے اُس امبر کی طرح تھیں جو ہر دن ایک نیا چاند سورج لے کے آتا ہے۔ کبھی نقرئی کرنوں سے دامن بھر دیتا ہے تو کبھی سنہری دھوپ سے لہر بہر کر دیتا ہے۔ گرمی ہوئی تو بارش گراتا ہے۔ دھوپ لگی تو بادلوں کا سائبان بن کر چھاوں پھیلا دیتا ہے۔ دادی پوتے کا رشتہ بڑا اٹل، انوکھا اور مستحکم ہوتا ہے۔ اسمیں فرشتوں جیسی پاکیزگی، بچوں جیسی معصومیت اور پھولوں جیسی ملائمت ہوتی ہے۔ ہر پوتا دادی کا لاڈلا ہوا کرتا ہے۔ میں بھی اپنی دادی کا لاڈلا تھا۔ میں اپنی دادی سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ وہ بھی تو مجھے بیحد چاہتی تھی۔ سچ کہوں تو اُسکی جان مجھ میں بسی ہوئی تھی۔ جب دادی کا انتم سمے آگیا تو میں اُسوقت روزگار کے سلسلے میں دلی میں تھا۔ مجھے جب تار سے یہ اطلاع ملی کہ دادی کی حالت نازک ہے تو میں اُسی شام بس پکڑ کر سری نگر کے لئے روانہ ہوا۔ مجھے گھر پہونچنے میں دو دن لگے۔ گھر والوں کو لگتا تھا کہ دادی اب گئی کہ تب گئی۔ دادی کی سانسیں جونہی اُکھڑنے لگتیں تو وہ سنبھالا لے کر اُٹھتیں۔ یہ جیون مرن کا کھیل دو دن تک چلتا رہا۔ جب میں گھر پہونچا تو دادی آخری سانسیں گن رہی تھیں۔ جب میں نے اُسکے منہ میں گنگا جل ڈالا تو اُسنے الوداعی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ یعنی وہ تین دن تک اپنی موت کو ٹالتی رہی اور میرا انتظار کرتی رہی۔

دادی کو گزرے ہوئے چوبیس برس بیت گئے ہیں۔ ان چوبیس برسوں میں وہ اس سے پہلے کبھی بھی میرے خواب میں نہیں آئی۔ ان چوبیس برسوں میں تو بہت کچھ بدل گیا۔ ہم خانہ بدوش ہو گئے۔ آشیانہ چھن گیا۔ ہم نے تنکا تنکا سمیٹ کر ایک نیا آشیانہ جموں میں بنالیا۔ پچھلے سال کی بات ہے میں اپنے کمرے میں سویا تھا کہ دادی میرے سپنے میں چلی آئی۔ بہت ہی نحیف اور لاغر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا

دادی کیا بات ہے بہت کمزور دکھائی دے رہی ہو؟ تو کہنے لگی من بڑا بیاکل ہے بچہ۔ کتنے برس ہو گئے کہ میں جوالا جی کا درشن نہیں کر پائی۔ بار بار مجھے دیوی کا بلاوا آ رہا ہے۔ کیا کروں یہ لوگ مجھے چھوڑ نہیں رہے ہیں بچہ۔ اگر تم میری جگہ چلے جاؤ گے تو میرے من کو بڑا آنند ملے گا بچہ۔ کیا تم اپنی دادی کی اچھا کا پالن کرو گے؟ میں نے کہا دادی تیرے لئے تو میں پھانسی کے پھندے پر ہنس ہنس کے جھول جاؤں گا۔ زہر کا پیالہ امرت کی طرح پی جاؤں گا۔ میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔

مجھے اپنی دادی کی اس خواہش کو پورا کرنا تھا سو میں نے ایک دن کھیر یوہ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں سویرے سویرے گھر سے نکلا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس لئے میں گاڑی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑتا رہا۔ اننت ناگ جانے والی بسیں بہت کم تعداد میں چلتی ہیں۔ اب تو بسیں کم سوموا اور منی بسیں چھوٹے چھوٹے علاقوں میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اسے میری خوش قسمتی کہئے یا میری بد قسمتی کہ مجھے ایک ٹاٹا سوموملا جسمیں دو تین سواریاں پہلے سے ہی بیٹھی تھیں اور یہ سواریں دزدانہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں جیسے کسی شکار کی تلاش میں ہوں۔ ایک نے مجھ سے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے بھائی؟''

''میں نے کہا جانا تو مجھے کھیر بھوانی ہے پر اگر کوئی اننت ناگ کی گاڑی مل جائے تو میں آگے کوئی اور سومویا ٹیکسی پکڑ لوں گا۔''

''آپکو کھیر بھوانی جانا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں بھائی مجھے کھیر بھوانی جانا ہے''

وہ کہنے لگا۔ ''آپ نے خدا سے اس وقت کچھ اور مانگا ہوتا تو وہ آپ کی مراد ضرور پوری کر دیتا۔ ہم اُسی طرف جا رہے ہیں۔ کھر وہ سے بھی آگے۔ ہم ایک سواری کی تلاش میں تھے۔ خدا نے آپ کو ہمارے پاس بھیج دیا۔''

اتنا کہہ کر اُسنے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس چھین کر گاڑی میں رکھ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی میں بٹھا دیا۔

کبھی کبھی نا آدمی اپنی قسمت پر یونہی ناز کرنے لگتا ہے۔ مجھے لگا کہ یہ دادی کا آشیرواد تھا کہ کنواں میرے پاس آ گیا مجھے کنویں کے پاس جانا نہیں پڑا۔ میں گاڑی میں بیٹھے تین لوگوں سے باری باری باتیں کرنے لگا۔ راستے میں ہم سب بڑے بے تکلف ہوگئے۔ جہاں جہاں اُنہوں نے گاڑی چائے پانی کے لئے روک لی اُنہوں نے مجھے ایک پیسہ بھی خرچہ کرنے نہیں دیا۔ میں اُنکے اس خلوص اور اپنایت سے زیر بار ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جب ہم نے قاضی گنڈ پہونچے تو ڈرائیور بولا کہ اگر ہم سیدھے راستے سے جائیں گے تو ٹریفک جام میں پھنس جائیں گے اسلئے وہ گاڑی کو شارٹ کٹ سے لے جائے گا تا کہ ہم جلدی اپنی منزل تک پہونچ جائیں۔ میں نے اُسکے فیصلے سے صاد کیا۔ مجھے تو یہ سب بھلے لوگ لگ رہے تھے۔ انکے بارے میں کسی اشتباہ یا تشکک کا دل میں اُٹھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

میں ان راستوں سے واقف نہیں تھا جہاں سے وہ چلے جا رہے تھے۔ ڈرائیور اوبڑ کھابڑ راستوں سے گاڑی لے کر جا رہا تھا۔ ہم ایسی جگہ پہونچ گئے جو ایک دم سنسان تھی۔ ایکطرف ننگ دھڑنگ پہاڑ تھے تو دوسری طرف کھائیاں تھیں اور بیچ میں ایک کچی سڑک تھی جس پر ہماری گاڑی کسی بیمار اور تھکے ماندہ مسافر کی طرح چل رہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے بریک ماری۔ گاڑی کھڑی ہوگئی۔ وہ گاڑی سے اُتر کر میرے پاس آیا اور دروازہ کھول کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ عجیب اور ڈراونی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ دفعتاً وہ تینوں مسافر مجھ پر ٹوٹ پڑے اور اُنہوں نے مجھے چت کر کے میری تلاشی لی۔ میری جیب سے سارا پیسہ اور میرے کریڈٹ کارڑ نکال کر اُنہوں نے میری گردن پر چاقو رکھ کر مجھ سے پاس وڑ پوچھا۔ میری حالت اُس بکرے جیسی تھی جسے چند لمحوں میں ذبح کیا جانا ہو۔ اس ناگہانی یلغار سے میرا ذہن ماوف ہو چکا تھا۔ میں سوچنے سمجھنے کی حالت میں تھا ہی نہیں۔ جب اُنہوں نے مجھے ایک زور کی لات ماری اور مجھ سے میرا پاس وڑ پوچھا اور ساتھ ہی مجھے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میرا پاس وڑ غلط نکلا تو وہ مجھے اسی جگہ زندہ دفن کر دیں گے۔ مرتا کیا نا کرتا۔ میں نے اُنہیں صیح پاس وڑ بتا دیا۔ دو لوگ وہ نوٹ کر کے گاڑی لے کر نکل گئے اور دو آدمی، میرے سر پر موت بن کر کھڑے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد جب میرے حواس بحال ہونے

لگے تو یہ سوچکر میرا دل بیٹھا جانے لگا کہ یہ میرا سارے پیسہ تو نکال دیں گے اور اُسکے بعد یہ میرا کام تمام کردیں گے۔

شام ہونے لگی تھی۔ سرمئی غبار پہاڑوں سے اُتر کر گھاٹیوں اور ڈھلانوں کو گھیرنے لگا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اسی طرح میری زندگی کا اُجالا بھی دھیرے دھیرے سیاہی کی قبر میں دفن ہوتا جارہا ہے اور پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیاہی کا کفن اُوڑھ کر سو جاوں گا اور میرے گھر والوں کو میری بو باس بھی نہیں ملے گی۔ جب رات ہوئی تو وہ دولوگ لوٹ کے آ گئے۔ اُنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا اور پھر مجھے گولی ماردی۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک مسلم بزرگ کے گھر میں پایا۔ میرے گرد بہت سارے آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں جوان بھی تھے بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی تھے۔ مجھے لگا کہ میں مرچکا ہوں اور یہ جو میرے گرد غول بنا کر بیٹھے ہیں یہ سارے فرشتے ہیں جو روپ بدل کر آئے ہیں اور اب میرے سامنے میرا لیکھا جوکھا رکھیں گے اور پھر مجھ سے میرے کرموں کا حساب مانگیں گے۔ یہی سب کچھ میں نے جیتے جی سنا تھا کہ مرکر کرموں کا حساب مانگا جاتا ہے۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اس بات کی تصدیق کرنے کے لئے کہ آیا میں زندہ ہوں یا مرچکا ہوں میں نے سوالیہ نگاہوں سے میرے سرہانے بیٹھے بزرگ سے پوچھا۔ ’’کیا میں زندہ ہوں؟‘‘

’’اللہ کا شکر ہے کہ اُسنے تمہیں بچالیا۔ تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ محفوظ و مامون بھی ہو‘‘

’’آپ لوگ کون ہو؟‘‘

’’بیٹا میرا نام حاجی اکرم ہے۔ یہ میرا پریوار ہے۔ میری بیوی میرے بیٹے، میری بہویں، میرے پوتے اور میری پوتیاں۔ ہم سب نے مل کر تمہاری سلامتی کے لئے دعائیں کیں۔ ڈاکٹروں نے بھی تمہاری بچنے کی آس چھوڑ دی تھی۔ گولی لگنے سے تمہارا بہت خون بہہ چکا تھا۔ اگر اور تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو تمہارا بچنا محال تھا۔ میرے مولا نے میری لاج رکھ لی۔ میں اپنی ماں کو دئے ہوئے وعدے کی لاج رکھ سکا‘‘ کہہ کر وہ رونے لگا۔ مجھے یہ سب کچھ خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ جب اُن

لٹیروں نے مجھے گولی ماری تب تک میں ہوش میں تھا۔ اُسکے بعد کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ اسکے بعد کی کہانی جاننے کے لئے میں بے چین تھا۔ میں نے اُس بزرگ کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''بابا مجھے یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیسے پہونچ گیا''

وہ بزرگ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر وہ ایک لمبی خاموشی کے بعد مجھ سے گویا ہوا۔

''شاید تم یقین نہیں کرو گے مگر یہ سچ ہے۔ کل رات میرے خواب میں لل عارفہ آ گئیں۔ اُسکا پیرہن تار تار تھا۔ جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ کہنے لگی اکرم میرے بچے یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے بچوں کا خون کیوں بہایا جا رہا ہے۔ میں یہاں چین سے رہ نہیں پا رہی ہوں۔ بار بار اپنے بچوں کے لئے بیاکل اور پریشان ہو رہی ہوں۔ ابھی ایک بچہ تمہارے گاؤں کے باہر گھائل پڑا ہے۔ جا اُسے اُٹھا کر لے آ۔ اُسکی مرہم پٹی کراو۔ وعدہ کر مجھ سے کہ تو ابھی جائے گا اور اُس کی جان بچا لے گا''

میں نے ماں کو جس حال میں دیکھا میں رو پڑا۔ میں فوراً اُٹھا اپنے بچوں کو جگا کر اُنہیں اس خواب کے بارے میں بتا دیا۔ بچے پہلے آنا کانی کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ آدمی ہر رات خواب دیکھتا رہتا ہے۔ کیا کوئی خواب سچ نکلتا ہے۔ مجھے اپنے اس خواب کی سچائی پر سو فیصدی یقین تھا سو میں نے بچوں کی ایک نہ سنی اور میں ہاتھ میں لالٹین لے کر نکل پڑا۔ بچے میرا دل رکھنے کے لئے میرے پیچھے پیچھے چل پڑے ۔ ہم سب لوگ ہاتھ میں لالٹینیں لے کر تمہیں تلاش کرنے لگے۔ میرا خواب سچ نکلا۔ تم ہمیں گاؤں سے دو کوس دور ایک نالے کے پاس خون میں لت پت پڑے ملے۔ ہم نے تم کو اُٹھا کر گھر پہونچا دیا اور پھر اُسی وقت گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے کر گئے۔ وہاں تمہارے بدن سے گولی نکالی گئی اور تمہیں خون چڑھایا گیا۔ چار دن تم اسپتال میں رہے۔ ہم باری باری تمہارے پاس بیٹھتے۔ جب ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ اب خطرے سے باہر ہے تو ہم تمہیں اپنے گھر لے آئے''

یہ ساری حقیقت جان کر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بوڑھے بزرگ نے میرے آنسو پونچھ لئے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

''نہ جانے یہ میرے کشمیر کو کیا ہو گیا۔ یہ میرا وہی کشمیر ہے جہاں وحشی جانور بھی یہاں کے مزاج

اور ماحول کو دیکھ کر اپنے حیوانی صفات چھوڑ چکے تھے۔ وہ کسی انسان کا شکار نہیں کرتے تھے کیونکہ اُنکا اپنا ایک بھرا پرا جنگل تھا۔ وافر مقدار میں شکار میسر تھا۔ وہ آدم خور کیوں بن جاتے۔ اب حیوان تو حیوان انسان بھی آدم خور بن چکے ہیں۔ اپنے ہی بھائیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ بھی دھوکے سے۔ مجھے کشمیر کی اس موجودہ صورت حال پر رونا آتا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی اور بد دیانتی کا دور دورہ ہے۔ یہ مت سمجھنا بیٹے کہ اُنہوں نے تمہیں اسلئے لوٹا کہ تم ایک کشمیری پنڈت ہو۔ تمہاری جگہ کوئی مسلمان ہوتا تو وہ اُسے بھی اسی طرح لوٹ کر گولی مار دیتے۔ آجکل چور لٹیروں کا راج چل رہا ہے۔ کسی کو خدا کا خوف ہے ہی نہیں۔ بس پیسے کے پیچھے لگے ہیں۔ ہر کسی کو بنگلہ چاہیے، گاڑی چاہیے، زندگی کی تمام تر آسائشیں چاہیں۔ چاہے اسکے لئے کسی کا خون کیوں نہ کرنا پڑے۔''

میں من ہی من سوچ رہا تھا کہ انسان کتنا بھی وحشی بن جائے، انسانیت مرتی نہیں۔ کسی نہ کسی روپ میں کہیں نہ کہیں زندہ رہتی ہے۔ یہ خاندان بھی اُسی انسانیت کی مثال تھا۔ میں نے اُس بزرگ کے چہرے پر جو پاکیزگی کا نور دیکھا۔ اُسکی آنکھوں میں جو سچائی کی چمک دیکھی، مجھے لگا کہ وہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ وہ ایک فرشتہ ہے جو انسانیت کی مشعل جلائے بیٹھا ہے۔ میں نے زیر بار نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ کر کہا۔

''بابا میں کس منہ سے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں کہ آپ لوگوں نے میری جان بچائی۔ میں آپ کے اس احسان کو تا زیست بھول نہیں پاوں گا۔''

''کیوں ہمیں کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو بیٹے۔ ہم نے تم پر کوئی احسان نہ کیا البتہ تم نے ہم پر یہ کرم کیا کہ مجھے اپنی ماں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ تم نہیں جانتے ماں لل عارفہ ہمارے لئے کیا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ وہی ماں ہے جس نے شیخ نور الدینؒ ولی کو اپنا دودھ پلایا تھا۔''

''میں زیادہ نہیں جانتا ہوں البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لل دید کے عقیدت مند صرف ہندو ہی نہیں ہر کشمیری مسلمان ہے جو اُسکا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیتا ہے اور اُسے اپنی ماں سمجھتا ہے۔ آجکل کے نوجوانوں کے لئے شاید یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوں مگر پرانی پیڑھی کے لئے یہ اُنکی اساس ہے، اُنکا

متاع بے بہا ہے۔"

"بالکل درست کہا تم نے۔ ہم لوگ روایت پرست رہے ہیں اور روایتیں کبھی مرتی نہیں ہیں کیونکہ وہ خون میں ہوتی ہیں اسلئے ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔"

"خیر اب آپ کے کرم اور دعاوں کے سہارے میرے زخم مندمل ہونے لگے ہیں۔ میں اب روبہ صحت ہو چکا ہوں۔ وہاں میرے گھر والے میرے لئے بہت فکر مند ہونگے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں کل ہی جوالا جی کے درشن کے لئے چلوں گا اور اُسکے بعد وہیں سے جموں چلا جاوں گا۔"

اُس بزرگ نے میرا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم جس مقصد سے یہاں آئے ہو میری دعا ہے کہ وہ جلدی پورا ہو جائے مگر ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اکیلے وہاں تک جا سکو گے۔ جہاں تم اتنے دن رکے ایک دو روز اور رک جاو۔ اللہ کو منظور ہوگا تو تمہاری مراد وہ ضرور پوری کریں گے۔"

اُنہوں نے مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ یہ سچ تھا کہ میرے زخم مندمل ہو چکے تھے مگر بہت سارا خون بہنے کی وجہ سے میں کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے چلنے پھرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ حاجی کا کہنا بجا تھا کہ ابھی میں اُس حالت میں نہیں تھا کہ میں اکیلے آگے کا سفر جاری رکھ سکوں۔ اسلئے اُسکی بات مان کر میں نے اپنا ارادہ دو تین دن کے لئے ٹال دیا۔ جب کہ میں گھر جانے کے لئے اتاولا ہوا جا رہا تھا۔

اگلے روز میں صبح اُٹھا، حاجی کے پوتے اشفاق کو لے کر میں گھومنے نکلا۔ تھوڑا سا چلتا تھا تو تھک جاتا تھا، پھر کسی چھتنار سایے میں بیٹھ کر ذرا سا ستا لیتا تھا اور پھر چلنے کی سعی کرتا تھا۔ تھوڑا سا گھومنے پھرنے کے بعد ہم گھر لوٹ آئے۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گیا۔ چار بجے نیند سے جاگا تو مجھے حاجی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے بچوں سے پوچھا ابا کہاں ہے تو اُنہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے اُسکے بیٹوں سے پوچھا تو وہ بھی کچھ بتا نہیں پائے۔ میں تردد میں پڑ گیا۔ آخر میرا محسن کسی کو بتائے بنا کہاں چلا گیا۔ میں اُن سے ملنے کے لئے بے چین ہونے لگا۔ میں اُٹھا اور اُنہیں ہر کمرے میں تلاش کرنے لگا۔ مجھے وہ ایک کوٹھری میں ملے۔ وہ زار زار رو رہے تھے۔ اُنہیں روتے دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ایسی کیا اُفتاد پڑی جو حاجی اسطرح بلک بلک کے رو رہا ہے۔ میں اُنکے پہلو میں بیٹھ

گیا اور بڑے نرم اور ہمدردانہ سر میں اُس سے پوچھا۔ ''ابا کیا ہوا آپ اسطرح پھوٹ پھوٹ کے کیوں رو رہے ہیں؟'' اُنہوں نے اپنے آنسو پونچھے اور پھر میری طرف ایسی شرمسار نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے اُنہوں نے میرے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہو۔

''ابا آپ چپ کیوں ہیں۔ کچھ بتاتے کیوں نہیں؟''

وہ مجھے ٹالتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا کبھی کبھی دل بھر آتا ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ آنسو بہانے سے نا من ہلکا ہو جاتا ہے اسلئے میری آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے۔''

میں حاجی کی جواب سے مطمعین نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''ابا آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ ایشور نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ اتنے نیک اور پارسا ہیں کہ آپ کو کبھی کانٹا بھی نہیں چبھ سکتا ہے پھر آپ اسطرح زار و قطار رو رہے تھے جیسے آپ کی کوئی عزیز شے آپ سے چھن گئی ہو۔ سچ سچ بتائے نا کیا بات ہے؟''

''تم سچ سننا چاہتے ہو؟''

''ہاں ابا''

''سن پاوگے؟''

''ابا موت کا سامنا تو کیا۔ اب موت سے بدتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہئے نا کیا بات ہے؟''

''بیٹا جس جوالا دیوی کے دیدار کرنے تم جانے والے تھے، اب تم جا نہیں پاوگے''

''کیوں''، میں نے مجسم سوال بن کے پوچھا۔

''اسلئے کہ کل رات وہ مندر جل کر خاکستر ہو گیا''

''نہیں نہیں آپ کو کسی نے خلط اطلاع دی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یہ خبر اب تک چھپی نہیں رہتی۔ ریڈیو، ٹی وی سے یہ خبر عام ہوئی ہوتی۔''

''بیٹے جو کل ہونے والا ہوتا ہے اُسکی آگاہی مجھے ایک دن پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو ہم کل صبح ہی کھریوہ چلیں گے۔ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے سب پتا چل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم کل چلیں گے''

اگلے روز ہم ٹھنڈے ٹھنڈے ہی حاجی کی کار میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئے۔ کار حاجی کا بڑا بیٹا چلا رہا تھا۔ ہم آدھے پونے گھنٹے میں جوالا جی کے مندر تک پہونچ گئے۔ جونہی ہم وہاں پہونچے تو میں تیورا کے رہ گیا۔ جوالا جی کا مندر سچ مچ جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ حاجی مندر کی حالت دیکھ کر ایک بار رو پڑا۔ اتنے میں کئی مقامی لوگ حاجی کے گرد جمع ہو گئے اور اُسے تفصیل سے ساری واردات بیان کرنے لگے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مندر میں اچانک آگ لگی۔ آگ دیکھ کر سارا گاوں، آگ بجھانے کے لئے دوڑا مگر آگ اتنی شدید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے مندر کو اُس نے اپنی لپیٹ میں لیا اور مندر کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا۔ میں مندر کی چوکھٹ پر ماتھا ٹکائے رو رہا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی دادی کو دیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اتنے میں جیسے کسی نے میرے کان میں آ کے سرگوشی کی۔

''رو کیوں رہے ہو میرے بچے۔ میں کہیں نہیں گئی ہوں۔ میرا دام ہی جل گیا نا۔ میں تو کہیں بھی واس کر سکتی ہوں۔ بچہ کیسی مسجد کیسا مندر۔ جو دیکھو وہ دل کے اندر۔ جس نے تمہاری زندگی بچائی۔ جو تمہیں یہاں تک لے آیا۔ کبھی تم نے اُسکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ جا کے اُسکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لے میں تمہیں اُن آنکھوں میں نظر آوں گی۔''

میں سرعت سے اُٹھا اور حاجی کی طرف لپکا۔ وہ اُداس اور غمگین کھڑا تھا۔ میں نے اُسکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے جوالا دیوی کے درشن ہوئے۔ میں نے ابا سے کہا۔ ''چلو ابا گھر چلتے ہیں۔ میری مراد پوری ہو گئی۔ دادی کو دیا ہوا میرا وچن بھی پورا ہو گیا۔''

حاجی کچھ نہ بولا۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا اور ہم تینوں وہاں سے گھر کے لئے چل پڑے۔

# کھاں گیا میرا لال

میں چھانہ پورہ کے جس محلے میں رہتا تھا، وہ بھائی چارے کی ایک عمدہ مثال تھا۔ یہاں دس فیصد ہندوں کے ساتھ نوے فیصد مسلمان شیر وشکر کی طرح رہ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی حلیمہ آپا کا گھر تھا۔ حلیمہ آپا یعنی نور چاچا کی بیوی۔ حلیمہ آپا عمر کے ساٹھ پڑاو پار کر چکی تھی مگر مزے کی بات یہ تھی کہ وہ ہر ایک کے لئے حلیمہ آپا تھی۔ وہ چاہے دس برس کا چھورا ہو یا اسی برس کا بزرگ۔ ہر کوئی اُسے حلیمہ آپا کے نام سے ہی بلایا کرتا تھا۔ سلیمہ آپا کا ایک بھرا پرا پریوار تھا۔ اُنکے چھ بچے تھے جن میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑا امجد تھا جو کہ باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ نور چاچا کی مائسیمہ کے لکر بازار میں منیاری کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جسے باپ بیٹا مل کر چلا رہے تھے۔ امجد کے بعد اسلم تھا جو میرا ہم عمر تھا اور میرے ساتھ ہی سکول میں پڑھتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں لنگوٹیا یار تھے اسلیئے ہمارا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ حلیمہ آپا بڑی ہی حلیم اور خوش مزاج عورت تھی۔ وہ مجھ میں اور اپنے بچوں میں کوئی امتیاز نہیں برتتی تھی۔ اُسکے ہاتھوں میں جادو تھا۔ وہ جو کچھ بھی پکاتی تھی وہ اتنا لذیذ ہوتا تھا کہ کھانے والے اُنگلیاں چاٹ کے رہ جاتے تھے۔ مجھے کھانے کی یہی للک بار بار اُنکے گھر تک لے جایا کرتی تھی۔ اسلم میری کمزوری سے واقف تھا اسلیئے جس دن وہ گوشت پکاتے تھے، اسلم مجھے کسی نہ کسی بہانے اپنے گھر پر بلاتا تھا اور پھر مجھے حلیمہ آپا کے ہاتھوں بنے ہوئے گوشتابہ، یا روغن جوش کھانے کا موقع ملتا تھا۔ یوں تو ہمارے گھر میں روز گوشت پکتا تھا۔ ہمارے معاشی حالات اسلم کے گھر کے حالات سے کہیں بہتر تھے۔ میرے والد ایک اونچے سرکاری عہدے پر فائض تھے۔ اُنکی بالائی آمدنی، اُنکی محنت کی کمائی سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی اسلیئے ہمارے گھر میں ہر روز گوشت پکنا ایک معمول سا بن گیا تھا مگر جو مزہ حلیمہ آپا کے ہاتھوں پکے ہوئے گوشت کا ہوتا تھا وہ مزہ میرے گھر کے پکے ہوئے گوشت میں کہاں۔

حلیمہ آپا بہت ہی وضع دار اور سلیقہ مند خاتون تھی۔ اپنی خوش خلقی اور شرافت سے اُسنے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ جو اُس سے ایک بار ملتا تھا وہ اُسکا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میرے لئے تو وہ ایک چنار کے پیڑ کی طرح تھی جسکے چھتنار سایے میں سبھی سکون و فرحت پاتے ہیں۔ اُسکے ہاتھ ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

متوسط گھرانہ ہوکر بھی اُس گھر سے کوئی خالی نہیں جاتا تھا۔ در پر جو بھی سوالی آ کے کھڑا ہو جاتا تھا حلیمہ آپا اُسکی جھولی بھر دیتی تھی۔ بار بار اُسے شوہر کی ڈانٹ کھانی پڑتی تھی کہ وہ اپنا گھر خالی کر کے دوسروں کے گھر بھر رہی ہے۔ پر وہ اپنی خو بو بدلنے والی کہاں تھی۔ وہ وہی کرتی تھی جو اُسکا دل کہتا تھا۔ دراصل اُسنے ایسا دردمند دل پایا تھا جو اپنے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی تڑپتا تھا۔ کسی کی بھوک اُس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اگر کسی کو اُداس یا دکھی پاتی تھی تو ہفتوں غمگین اور پریشان رہتی تھی۔ ایسی تھی وہ

اسلم میرا بہت پیارا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بنا ایک پل بھی رہ نہیں پاتے تھے۔ یوں کہئے کہ ہم ایک جان اور دو قالب تھے۔ جو ہمیں نہیں جانتے تھے وہ یہی سمجھتے تھے کہ ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔ رات کے دس بارہ گھنٹے ہی ہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے تھے۔ باقی کے بارہ گھنٹے تو ہم ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ ہماری عادتیں اور خصلتیں بھی کسی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ بس اسلم اور مجھ میں فرق صرف اتنا تھا کہ میں جتنا شانت سبھاو کا تھا، وہ اتنا ہی گرم مزاج کا تھا۔ اُس میں تحمل کا یارانہ تھا۔ زرا سی بات اُس سے اُٹھائی نہیں جاتی تھی۔ اسکول کے لڑکے اُس کے جھگڑالو پن کی وجہ سے بچ کے ہی رہتے تھے۔ وہ زرا زرا سی بات پر مرنے مارنے پر اُتاولا ہو جاتا تھا۔ اُسکے اسی جھگڑالو سبھاو کی وجہ سے کوئی اُسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ میں اُسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا مگر وہ کہاں سدھرنے والا تھا۔ وہ تو کتے کی وہ دم تھا جسے بارہ برس نلکی میں رکھا پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہی۔

میٹرک تک تو ہم ساتھ ساتھ تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد جب ہم کالج میں داخلہ لینے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کشمیر میں شورش کا آغاز ہوا۔ ہمیں بدلتے حالات کے پیش نظر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جانا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں ایک خونیں جنگ کی شروعات ہو چکی تھی۔ جس وادی میں پٹاخوں کی آواز بھی خال خال ہی سنائی دیتی تھی اُسی وادی میں بم اور بارود کا ایسا خونی کھیل چلا کہ اقلیتی فرقے کے لوگ دہشت زدہ ہو کے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میں اپنے گھر اور اپنے دوستوں کو چھوڑ کے جانا نہیں چاہتا تھا مگر حالات اس حد تک بدتر ہو چکے تھے کہ موت آٹھوں پہر سر پر منڈھلاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ نہ چاہ کر بھی مجھے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گھر کو الوداع کہنا پڑا۔ وہ بچھڑنے کا منظر میں جب بھی یاد

کرتا ہوں تو شدت غم سے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ حلیمہ آپا ہمارے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُسکی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگی تھی۔ اُسنے لپک کر میری ماں کو اپنے گلے سے لگایا اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پتاجی غم والم کی مورت بنے دور کھڑے تھے۔ وہ جیسے گنگ ہو چکے تھے۔ وہ زبان سے کچھ بول نہیں پا رہے تھے مگر اُنکی آنکھوں میں درد کا جو ساگر موجیں مار رہا تھا وہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ اندر سے کتنے دکھی ہیں۔ حلیمہ آپا نے سسکیاں بھرتے ہوئے میری ماں سے کہا۔ ''سرلا بھابی میں تم سے یہ نہیں کہوں گی کہ مت جاو کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آج جس طرح کا ماحول بن چکا ہے اُسمیں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہم تو اس جگہ کو چھوڑ کے بھی نہیں جاسکتے کیونکہ ہم روٹی روزی کے پیچ میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ یہاں سے نکلنے کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس جاتے جاتے میں تم سے صرف اتنی سی منت کرتی ہوں کہ جب کبھی حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو اپنے گھر کو بھولنا مت۔ لوٹ کے آجانا ضرور۔ اپنے لئے نہ سہی ہمارے لئے ہی سہی پر لوٹ کے آنا ضرور''

یہ تھی حلیمہ آپا سے ہماری آخری ملاقات۔ میں اسلم سے مل نہ سکا کیونکہ وہ میرے جانے کی خبر سے اتنا دکھی تھا کہ اُسنے اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کر کے رکھا تھا۔ میں اُس سے ملنے گیا مگر اُسنے دروازہ نہیں کھولا۔ جب ہم ایک سومو میں سوار ہو رہے تھے تو میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جب الوداعی نگاہوں سے حلیمہ آپا کے گھر کی طرف دیکھا تبھی میری نظر اسلم پر پڑی جو کہ کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا پھپھک پھپھک کے رو رہا تھا۔ مجھ سے اُسکے آنسو دیکھے نہ گئے۔ میں نے سومو سے کودنے کی کوشش کی مگر پتاجی نے مجھے روک لیا اور مجھے ڈانٹ کر سیٹ پر بٹھا دیا۔

گھر چھوٹ گیا۔ دوست احباب چھوٹ گئے۔ وہ گلیاں اور وہ کوچے چھوٹ گئے جن میں کھیل کر میں جوان ہوا تھا۔ ہم گلستان سے نکل کر نخلستان میں پہونچ گئے۔ ہمارا قافلہ ایک ایسے شہر میں جا کے رکا جہاں سب کچھ تھا مگر اپنا پن نہیں تھا۔ جہاں مائیں تو بے شمار تھیں مگر حلیمہ آپا جیسی کوئی ماں نہیں تھی۔ دوست تو بہت سارے تھے مگر اسلم جیسا کوئی جان چھڑکنے والا دوست نہ تھا۔ یہاں گھٹن نہیں تھی۔ یہاں آزادی تھی مگر دل کا سکون نہیں تھا۔ یہاں کاروبار تو تھا مگر پیار نہیں تھا۔ یہاں کھلا پن تھا مگر اپنا پن نہیں تھا۔ یہ شہر تھا

جموں جو کہ اسی ریاست کا ایک حصہ ہے۔ ہم اسی شہر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ہم دو کمرے کے ایک کرایے کے مکان میں کھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ شاہانہ عادتیں قصہ پارنیہ بن چکی تھیں۔ سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا تھا اسلیئے یہاں روٹی کے لالے پڑے تھے۔ جو کچھ بھی سرکار کی طرف سے ریلیف میں مل رہا تھا اُسی سے زندگی کی گاڑی کو چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے یہیں کے ایک کالج میں داخلہ لیا۔ دن میں میں کالج میں پڑھائی کرتا تھا، رات کو ایک ہوٹل میں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ میں اپنے پتا کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ میرے پتا جی بڑے ہی حوصلہ مند انسان تھے۔ وہ کبھی حالات کے سامنے پست نہیں ہوئے۔ میں نے زندگی میں کبھی اُنہیں آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ جب دادا جی کا سورگباش ہوا تب بھی وہ نہیں روئے۔ لیکن اُسی پتا کو میں نے تب روتے دیکھا جب مالک مکان نے اُنہیں بری طرح سے سب کے سامنے ڈانٹ لیا تھا۔ اُن سے یہ خطا ہوئی تھی کہ اُنہوں نے دیوار میں کیل ٹھونک کر بھگوان کرشن کی تصویر ٹانگ دی تھی۔ ماں نے جب اُنہیں آنسو بہاتے دیکھا تو اُنکا کلیجہ چھلنی ہوا۔ وہ پتا جی کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''ان لوگوں کی باتوں کا کیا برا ماننا۔ آج ہم پر برا وقت آن پڑا ہے۔ کہتے ہیں جب مصیبت آتی ہے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ ہمیں اس برے وقت کا جی داری کے ساتھ سامنا کرنا چاہیے۔ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ کہتے ہیں کہ بارہ برس کے بعد گورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ہمارے دن بھی پھر جائیں گے۔'' پتا جی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''سچ کہوں سرلا۔ ہم نے اپنا گھر چھوڑ کے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں یاد ہے سنجے نے کرکٹ کی بال سے نور محمد کے کتنے سارے کھڑکیوں کے کانچ توڑ دیئے تھے۔ حلیمہ یا نور محمد نے کبھی تم سے کوئی شکایت کی؟۔ وہ اپنا پن اور بھائی چارہ اب ہمیں کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ہم بھلے ہی اُن لوگوں کو کوسیں کہ اُنہوں نے ہماری کوئی مدد نہیں کی مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم اُن کے بنا اُدھورے اور نامکمل ہیں۔ کہتے ہیں کہ اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ہی ڈالے گا۔ وہ اگر ہمیں مارتے بھی نا تو بھی پانی پلا کر مارتے۔ اس طرح ہمیں ذلیل وخوار نہ کرتے۔ اس طرح ہماری مجبوری کا فائدہ نہ اُٹھاتے۔''

ماں چپ تھی۔ پتا جی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے جا رہے تھے اور ماں یادوں کی سنگینوں سے لہولہان ہوتی جا رہی تھی۔ میں غم کی مورت بنے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں بس ایک آندھی چل رہی تھی۔ میں ایک ساتھ سینکڑوں سوالات سے نبرد آزما ہو رہا تھا۔ کیا میرے ماتا پتا اسی طرح غیروں کی ڈانٹ پھٹکار سنتے رہیں گے؟ کیا وہ اسی طرح مجبور اور مظلوم بن کر جئیں گے؟ مجھے اُنہیں اس منجدھار سے نکالنا ہوگا۔ میں نے رات دن محنت کر کے اسی شہر میں اپنی گریجویشن پوری کی اور اُسکے بعد میں نے جرنلزم کا کورس کیا۔ یہاں نوکری پانے کے چانس بہت کم تھے اسلئے میں گھر والوں کو جموں میں چھوڑ کر دلی چلا گیا۔ یہاں ایک رشتہ دار کی وساطت سے میں ٹیلی ویژن میڈیا کے ساتھ جڑ گیا۔ تقدیر سے مجھے اسی میڈیا ہاوس میں رپوٹر کی نوکری مل گئی۔ نوکری کیا ملی ایسا لگا جیسے سوکھے دانوں پانی پڑا۔ ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی۔ آٹھ دس برس کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ اس دوراں اسلم سے میرا کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں نے حلیمہ آپا یا اسلم کو یاد نہیں کیا۔ ایسا شاید کوئی پل ہی رہا ہوگا جب میں نے اُنکو یاد نہیں کیا۔ رات کو جب میں سونے کی کوشش کرتا تو مجھے میرا گھر یاد آتا تھا۔ گھر کی یاد آتے ہی سب سے پہلے حلیمہ آپا یاد آتی تھی۔ اُسکے ہاتھ کی بنی ہوئی ضیافتیں یاد آتی تھیں۔ اُسکی باتیں یاد آتی تھیں۔ بتاشے میں گھلی ہوئی اسکی میٹھی میٹھی باتیں۔ اسلم کی شرارتیں یاد آتی تھیں۔ وہ حسین پل اور وہ خوشگوار لمحے یاد آتے تھے جو ہم نے ساتھ گزارے تھے۔ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر آ گئے تھے۔ بس اپنے ساتھ یادوں کی یہ پوٹلی لے کر آئے تھے جسے کھول کے ہم اپنے دل رنجور کو بہلاتے رہتے تھے۔

ایک دن مجھے سری نگر جا کر ایک نیوز کوریج کرنے کا حکم ملا۔ سری نگر کا نام سنتے ہی میرے روئیں روئیں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے مجھے جنت کی بشارت مل گئی ہو۔ یہ سوچ کر میں پھولے نہیں سما رہا تھا کہ میں سری نگر پہونچ کر اسلم سے ملوں گا۔ وہ اپنے شکوے شکایتوں کے دفتر کھول کے رکھے گا اور میں اُس سے اپنے گلے شکوے بیان کروں گا۔ سری نگر ائیرپورٹ پونچتے ہی میں ٹیکسی لے کر سیدھے چھانہ پورہ پہونچ گیا۔ جب میں اپنے گھر کے سامنے رکا تو میں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ گھر کیا تھا ایک کھنڈر نما محل جسکی دیواریں تو سلامت تھیں مگر کھڑکیاں اور دروازے غائب تھے۔ مجھ میں اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میں نے سوچا کہ نور چاچا کے ہوتے ہوئے اس گھر کی ایسی حالت کیسے ہوگئی۔ میں نے اپنے گھر سے نظریں ہٹا کر حلیمہ آپا کے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ تو جوں کا توں کھڑا تھا۔ میں کلیجہ تھام کر آگے بڑھا اور ہولے ہولے دروازہ تھپتھپانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ آدمی نے دروازہ کھولا۔ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''حلیمہ چاچی گھر میں ہیں؟''

وہ شخص پہلے مجھے کریدنے والی نگاہوں سے گھورنے لگا اور پھر اُسنے عجیب سے منہ بنا کر کہا۔

''کہاں سے آئے ہو بیٹے؟''

''دلی سے۔ اُن سے کہہ دو شمبھوناتھ جی کا فرزند سنجے ملنے آیا ہے۔''

وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے اندر گھر میں جیسے کھلبلی مچ گئی۔ گھر کے بیشتر افراد گرتے پڑتے باہر چلے آئے اور پھر مجھ سے دیوانہ وار لپٹ کر رونے لگے۔ میں بھی جذبات کے ریلے میں بہہ چلا تھا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ وہ مجھے اندر لے گئے۔ اندر کا نظارہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک کونے میں حلیمہ آپا پڑی تھی۔ وہ تو کھاٹ سے لگ چکی تھی۔ امجد مجھے اُسکے پاس لے گیا اور اُسے بٹھاتے ہوئے بڑی بے تابی سے بولا۔

''امی اپنا بنٹو تجھ سے ملنے آ گیا ہے۔''

اُسکے بے جان جسم میں جیسے جان آ گئی اور پھر اُسنے دونوں ہاتھ بڑھا کر میری چہرے کو ٹٹولا اور پھر مجھے سینے سے لگا کر وہ زار زار رونے لگی۔ بہت دیر تک یہ رونا دھونا چلتا رہا۔ جب ہمارے آنسو کچھ پچھ گئے تو میری آنکھیں بڑی بے چینی سے اسلم کو تلاش کرنے لگیں مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے امجد سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''اسلم دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ کہیں چلا گیا ہے کیا؟''

امجد نے ایک ٹھنڈہ آہ بھری اور اُسکے بعد وہ مجھے باہر لے جا کر مجھ سے گویا ہوا۔ ''سنجے اس گھر پر بڑی بپتا پڑی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ اسلم میں بچپن سے ہی ایک آگ بھری ہوئی تھی۔ بات بات پر وہ اُبل

پڑتا تھا۔ اُس میں تحمل کا یارا نہ تھا۔ اُسکی اس گرم مزاجی کا کچھ لوگوں نے خوب استمال کیا۔ جب بھی یہاں کوئی مظاہرہ ہوتا تھا وہ سب سے پیش پیش رہتا تھا۔ امی نے ابا نے اُسے بہترا سمجھایا کہ ان جھمیلوں سے دور رہ۔ کبھی بھی آفت میں پڑ جاو گے مگر وہ کہاں کسی کی سننے والا تھا۔ وہ تو ہمیشہ بھرا ہوا رہتا تھا۔ کبھی توڑ پھوڑ کرنے والوں کے پیش پیش رہتا تھا تو کبھی سنگ بازوں کے آگے۔ حفاظتی دستے اُسکی جان کے در پے ہو گئے۔ ایک رات چار آدمیوں نے گھر پر دھاوا بول دیا جن کے منہ پر ڈھاٹھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ہم نے سوچا کہ وہ ٹاسک فورس والے تھے اسلیئے ہم اگلے روز پولیس تھانے میں اُسے چھڑانے چلے گئے مگر اُنہوں نے ہمیں یہ کہہ کر واپس لوٹا دیا کہ وہ اُنکی حراست میں نہیں ہے جا کر آرمی والوں سے پوچھو۔ ہم پاس کی چوکی میں فوجیوں سے ملنے گئے تو اُنہوں نے ہمیں علاقے کے پولیس تھانے میں جانے کے لئے کہا۔ اسلم نہ پولیس کی حراست میں تھا اور نہ فوج کی تحویل میں۔ آخر وہ کہاں تھا۔ اُسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ ہم یہاں سے وہاں دھکے کھاتے پھر رہے تھے مگر ہمیں اسلم کا کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اُسکے اس طرح لاپتہ ہونے سے امی نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بس اُسکی تصویر ہاتھوں میں لئے گلی گلی گھوم رہی تھی۔ کبھی وہ پولیس چوکیوں کے طواف کرتی ہوئی نظر آتی تھی تو کبھی وہ لال چوک میں اُن غم زدگان کے ساتھ نوحہ کرتی ہوئی نظر آتی تھی جن کے رشتہ دار لاپتہ تھے۔ وہ ہر آنے جانے والے سے بس ایک ہی سوال پوچھتی تھی میرا لال کہاں ہے؟ کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تھا۔

جب ایک سال بیت گیا اور ہمیں کہیں سے اسلم کی بو باس نہ ملی تو ہم سب اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر اُسے بھولنے کی کوشش کرنے لگے، مگر یہ نہ بھول پائی۔ یہ بھلا اپنے لختِ جگر کو کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ تو اُسکے وجود کا ایک حصہ تھا۔ وہ اُسکے شریر کی ایک کونپل تھا۔ ایک ماں کے لئے اپنی اولاد کا بھولنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ آٹھوں پہر اُسکی یاد میں آنسو بہاتی رہتی تھی۔ مسلسل رونے سے اُسکی آنکھیں کمزور ہونے لگیں۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب اُسکی بینائی جواب دے گئی۔ اُسکی زندگی میں تو اندھیرا پہلے سے ہی چھایا ہوا تھا، اب آنکھیں چلے جانے سے اس اندھیرے میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اب پچھلے ایک سال سے وہ صاحبِ فراش

ہے۔بس اسی بستر پر پڑی رہتی ہے۔ہاتھوں میں اسلم کی تصویر لیئے۔بس اسی تصویر کو آٹھوں پہر سینے سے لگائے رہتی ہے۔ہم نے تو اسلم کے لوٹ آنے کی آس چھوڑ دی ہے۔امی ہے کہ اب بھی اسی اُمید میں جی رہی ہے کہ ایک دن اُسکا اسلم لوٹ کے آئے گا۔ہم اس سے یہ بھی نہیں کہہ پاتے ہیں کہ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا کیونکہ ڈاکٹر نے ہمیں تنبہ کی ہے کہ ہم اُسکی آس اُمید کو توڑیں نا۔اسے یونہی بنے رہنے دیں نہیں تو یہ اُسی وقت دم توڑ دے گی جس پل اُسے پتا چلے گا کہ اسلم اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں۔کہاں سے اسکے اسلم کو ڈھونڈ کر لے آئیں؟''اسکے بعد امجد رو پڑا۔

ماحول میں رقت طاری تھی۔گھر، گھر نہیں لگ رہا تھا، ایک قبرستان لگ رہا تھا۔ایکدم موت کا سا سناٹا۔میں غم والم کے اس ماحول سے نکل جانا چاہتا تھا۔مجھ سے حلیمہ آپا کا درد دیکھا نہیں جا رہا تھا۔میں نے اُسے ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔میں اس حلیمہ آپا کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا جو کہ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑی تھی۔اُسکی آنکھوں میں درد کا اتھاہ ساگر چھپا تھا۔میں نے امجد سے وعدہ کیا کہ میں حلیمہ آپا کو اسطرح مرنے نہیں دوں گا۔میں اُسکی اُمیدوں کو دم توڑنے نہیں دوں گا۔میں اُسکے اسلم کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔آخر میری میڈیا کی دھونس آج کام نہیں آئے گی تو پھر کب آئے گی۔میں امجد سے رخصت لے کے بوجھل قدموں کے ساتھ نکل گیا۔

میں نے اسلم کو تلاش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔میں فوج کے اعلیٰ کمانڈروں سے ملا۔اُن سے کوئی سراغ پانے کا میں نے ہر ممکن نسخہ آزمایا مگر کوئی کامیابی نہیں ملی۔میں پولیس کے کئی افسروں سے ملا۔یہاں بھی نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔جب میں ہر طرف سے مایوس ہوا تو میں امجد سے لگر بازار کی دکان پر ملا۔میں نے امجد کو ایک سجھاؤ پیش کیا۔میں نے امجد سے کہا کہ حلیمہ آپا بینائی سے محروم ہو چکی ہے۔اگر ہم کسی اور کو اسلم بنا کے پیش کریں تو حلیمہ آپا اُسے پہچان نہیں پائے گی۔وہ اُسے ہی اسلم سمجھ کر جی اُٹھے گی اور اسطرح اُسکی زندگی بچ جائے گی۔امجد تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ ایسا آدمی ملے گا کہاں سے۔میں نے اُسے سمجھایا کہ میرے یونٹ میں ایک لڑکا ہے جو کہ یہیں کا ہے۔اُس لڑکے کی شکل کسی حد تک اسلم سے ملتی جلتی ہے امجد نے اس پلان کو ہری

جھنڈی دکھائی اور میں اُسے ہاتھ ملا کر چل پڑا۔

جس لڑکے کا میں نے امجد سے ذکر کیا تھا اُسکا نام شفیع تھا۔ میں نے اُسے اعتماد میں لے کر اُسے سمجھایا۔

''شفیع تمہیں ایک نیک کام کرنا ہے۔ تمہیں ایک مردہ جسم میں نئی جان پھونکنی ہے۔ یہ ایک ثواب کا کام ہو گا جس کے لئے میں تا زیست تمہارا احسان مند رہوں گا۔ کیا تم میرے لئے یہ نیک کام کرو گے۔''

شفیع دل کا بہت اچھا تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ میں اگلے روز اُسے اپنے ساتھ چھانہ پورہ لے گیا۔ امجد کو میں نے پہلے ہی خبر کی تھی۔ اُسنے حلیمہ آپا تک یہ خبر پہونچا بھی دی تھی کہ بنجے نے اسلم کا پتا لگا یا ہے۔ وہ اُسے لے کر آرہا ہے۔ جب حلیمہ آپا نے یہ خبر سنی تو وہ سچ مچ جی اُٹھی۔ جو بنا سہارے کے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی، وہ یہ خبر سن کر اپنے آپ کھڑی ہو گئی اور جا کر دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ امجد نے اُسے سمجھایا ''اتنی اتاولی مت ہو جاو امی۔ پولیس کا معاملہ ہے۔ آنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم ایسا کرو اندر جا کر بیٹھ جاو۔ اگر سردی لگ گئی تو طبعیت بگڑ جائے گی۔''

حلیمہ آپا تو اپنے بچے کے لوٹ آنے کے خمار میں اس طرح ڈوبی ہوئی تھی کہ سردی گرمی اُسکا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ تو پل پل گن رہی تھی۔ ایک ایک پل اُسکے لئے کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ تبھی گاڑی کا ہارن بجا۔ حلیمہ آپا ایکدم اپنے بچے کا سواگت کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اُسکی خوشی دیدنی تھی۔ جونہی میں شفیع کو اُسکے قریب لے کر گیا تو اُسنے بے ساختہ اپنی بانہیں اُسکی طرف بڑھا لیں اور پھر اُسکے چہرے کو ٹٹولنے لگی۔ اچانک وہ پیچھے ہٹی اور اُسکے بعد ایک زناٹے دار تھپڑ سے اُسنے شفیع کا استقبال کیا۔ ہم سب سناٹے میں رہ گئے۔ حلیمہ آپا بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی اور پھر دھم سے اپنے بستر پر گر گئی۔

ہم ماں کی ممتا کو فریب نہیں دے سکے۔ ہم ایک ماں کو دھوکہ نہیں دے سکے۔ اگلے روز حلیمہ آپا اپنے اسلم کو ڈھونڈنے وہاں چلی گئی جہاں سبھی بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔

☆☆

## میرے اپنے

ہم جونہی ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کے باہر نکلے تو محمد سلطان جو بہت دیر سے تاک لگائے بیٹھا تھا ایکدم ہماری طرف لپکا اور اپنا مریل سا ٹٹو میرے آگے کھڑا کر کے بولا۔

''صاحب گھوڑا لیجئے۔ بہت ہی اصیل اور رہدار گھوڑا ہے۔ ایکبار آپ میرے گھوڑے کی سواری کریں گے نا تو قسم خدا کی اسے کبھی نہیں بھولیں گے۔ صاحب آئے نا''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے زبردستی ٹٹو پر بٹھانے لگا۔ میں جھنجھلا کے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے ردعمل سے زرا سا پریشان یا خفیف نہ ہوا۔ وہ تو جگ بھری کے کانٹے کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا۔ میرے دوست گلزاری نے اُسے ڈانٹ دیا مگر وہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ ہمارے ڈانٹنے پھٹکارنے کے باوجود وہ ہمارا پیچھا چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ جیسے طے کر کے بیٹھا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ ہمیں اپنے ٹٹو پر بٹھا کر ہی رہے گا۔ بڑا ضدی آدمی تھا وہ۔ انجام کار وہ جیت گیا اور ہم ہار گئے۔ جب پیسے کی بات ہوئی تو وہ ہمیں ریٹ کارڑ دکھانے لگا۔ اب کے ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے اُس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ہم کوئی ٹورسٹ نہیں بلکہ مقامی لوگ ہیں اور ہم اُسے ریٹ کے حساب سے نہیں بلکہ اس ریٹ کے آدھے پیسے بھی نہیں دیں گے۔ وہ شاید بہت تنگی تکلیف میں تھا اسلئے وہ بنا کسی حجت کئے کم پیسے پر چلنے کے لئے راضی ہو گیا۔ مجبوری انسان سے کوئی بھی سمجھوتہ کروا سکتی ہے۔ وہ بھی سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوا۔

ہم دونوں الگ الگ ٹٹوں پر سوار ہو گئے۔ میں محمد سلطان کے ٹٹو پر سوار ہوا جو کہ واقعی اصیل تھا۔ ایڑ لگاتے ہوئے ہی چل دیا جب کہ اُسکے ساتھی کا ٹٹو بڑا اڑیل تھا۔ وہ گلزاری کو ادھر اُدھر دوڑانے لگا۔ گلزاری ڈر کے مارے چلائے جا رہا تھا جب کہ میں اُسکی بدحواسی دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا، سلطان کا ٹٹو خراماں خراماں چل رہا تھا اور محمد سلطان ہمارے پیچھے ٹٹو کے ساتھ قدم بہ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ راستے میں ہم بے تکلف ہو گئے۔ میں تکلف کے سارے بندھن توڑ کر اُسے پیار سے سولہ کاک کہہ کر بلانے لگا اور اُس سے اُسکے گھر کا حال چال پوچھنے لگا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولا۔

''میں پہلے ماگام میں رہتا تھا۔ وہاں ایک کشمیری پنڈت کے یہاں نوکری کرتا تھا اچھے خاصے دن کٹ رہے تھے میرے کہ اچانک تحریک شروع ہوگئی۔ ماگام کے سارے پنڈت گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اُنکے چلے جانے سے میں بے کار و بے روزگار ہو کے رہ گیا۔ جب فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو میں ماگام کا گھر بیچ کر ٹنگمرگ آ کے بس گیا۔ یہاں ایک گھوڑا خرید لیا۔ سوچا تھا یہاں آ کر میرے حالات سدھر جائیں گے مگر یہاں بھی حالات دگرگوں ہی بنے رہے۔ دو چار سال تک میں یہاں کسمپرسی کی حالت میں جیتا رہا۔ چار پانچ سال کے بعد تھوڑے تھوڑے ٹورسٹ آنے شروع ہوگئے اور اسطرح جینے کا آسرا ہو گیا''

''تمہیں کشمیری پنڈتوں کے چلے جانے سے بڑا دکھ ہوا ہوگا؟''

''شروع شروع میں تو بہت دکھ ہوتا تھا۔ لیکن اب میں اُن کو پانی پی پی کر کوستا رہتا ہوں۔ یہ پنڈت سالے کسی کے سگے ہوئے ہیں کیا جو میرے ہوتے۔ بڑے کمینے اور خود غرض ہیں یہ لوگ۔ جگ موہن نے کہا کہ کشمیر چھوڑ کے چلے جاؤ تو فوراً اُسکے کہنے پر عمل کیا اور اپنے پاس پڑوسیوں اپنے یار دوستوں کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔ میں آجکل اگر کسی پنڈت کو دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ خود تو جموں میں بیٹھ کر عیش کر رہے ہیں اور ہمیں یہاں چھوڑ دیا اکیلے مرنے کے لئے'' کہتے کہتے اُسکا گلا بھر آیا اور دل میں اُٹھے اس جذباتی ریلے کو آنکھوں کے راستے بہنے سے پہلے اُسنے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

میں ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی حالت میں تھا۔ وہ جس قوم کو کوس رہا تھا میں اُسی قوم کا فرد تھا۔ کیا مجھے اپنی پہچان ظاہر کرنی چاہیے یا اُس سے چھپانی چاہیے کیونکہ وہ اب تک مجھے مسلمان سمجھ بیٹھا تھا اسلئے اتنی بے خوفی سے وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ اگر اُسے اس بات کی آگہی ہوتی کہ میں ایک کشمیری ہندو ہوں تو شاید وہ کبھی اسطرح کی زبان استعمال نہ کرتا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اُسے اب زیادہ دیر تک دھوکے میں رکھنا نہیں چاہیے کیونکہ اگر گلزاری نے میری پہچان آشکارا کر دی تو سولہ کاک کو بہت بڑا صدمہ لگے گا۔ سو میں نے فیصلہ کیا کہ میں سولہ کاک کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کر ہی دوں۔ میں نے بڑے پیار اور اپنایت بھری لہجے میں سولہ کاک سے کہا۔

''سولہ کاک میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ وہ جو میرا دوست گلزاری ہے نا وہ مسلمان ہے جب کہ میں

ایک کشمیری پنڈت ہوں' میرے اس انکشاف سے کہ میں کشمیری پنڈت ہوں سولہ کا کا کے چہرے کا رنگ یوں اُڑ گیا جیسے اُسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ اُسکی حالت ایسی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ اسقدر بوکھلایا ہوا تھا کہ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ شرم وندامت سے آنکھیں جھکائے ساکت وصامت کھڑا تھا۔ میں اُسکی حالت دیکھ کر خود شرمسار وہ رہا تھا۔ جب اُسنے اپنے حواس یکجا کئے تو وہ مجھ سے آنکھیں ملا نہیں پایا۔ وہ ایک بے جان بت کی طرح زمین میں آنکھیں گاڑے بس کھڑا رہا۔ میں اُسکے ذہنی خلفشار اور جذباتی بحران کو سمجھ پا رہا تھا اسلئے میں گھوڑے سے اُترا اور اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''تم اسطرح اپنے آپ کو شرمسار کیوں محسوس کر رہے ہو۔ تم نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ تمہاری یہ کڑواہٹ اس بات کی غماز ہے کہ تم اب بھی اُن بچھڑے ہوئے پڑوسیوں سے کتنا پیار کرتے ہو۔ جو اپنے ہوتے ہیں اُنہیں پر غصہ کیا جاتا ہے۔ دراصل غصہ پیار کا دوسرا روپ ہے''

اُسکی آنکھوں سے آنسوں کا ایک سوتا اُبل پڑا اور وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ یہ وہ تڑپ تھی جو برسوں سے اُسکے دل کو برما رہی تھی۔ اُسے کچوکے مار رہی تھی۔ یہ وہ آنسو تھے نہ جانے کب سے اُسکی آنکھوں سے بہنے کے لئے مچل رہے تھے۔ آج برسوں کے بعد ان آنسوں کو بہنے کا راستہ مل گیا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اُسکے آنسو پونچھے اور پھر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''اگر میں تمہیں پانچ لاکھ روپے اس شرط پر دوں کہ تم اپنا گھربار، اپنی زمین جائیداد چھوڑ کر میرے ساتھ جموں میں جا کر رہو تو کیا تم ایسا کرو گے؟''

''میں جموں جا کر کیا کروں گا جہاں مجھے کوئی جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ میں تو جیوں گا بھی یہیں اور مروں گا بھی یہیں۔''

''فرض کرلو کہ کل کوئی لیڈر تم سے یہ کہے کہ تم ٹنگمرگ چھوڑ کے بارہمولہ میں جا کے بس جاؤ، جہاں رہنے کے لئے تمہیں ایک ٹینٹ دیا جائے گا اور ساتھ میں راشن پانی کے لئے ہر مہینے دس ہزار روپے ملیں گے تو کیا تم ٹنگمرگ کو چھوڑ دو گے؟''

''مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں اپنا گھر بار چھوڑ کے ٹنٹ میں جا کے رہوں۔ جس مٹی نے مجھے جنم دیا ہے میں اُس مٹی کو چھوڑ کے کیوں چلا جاوں۔ پیسے سے پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ روح کی بھوک نہیں ۔ میں اپنے روح کی پیاس کیسے مٹاوں۔ میں اپنے گاوں اور اپنے لوگوں کے بنا کیسے جی پاوں گا؟''

''جب تم شنکمرگ چھوڑ کے بار ہمولہ میں جا کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ کشمیری پنڈتوں نے جگموہن کے کہنے پر اپنی زمین جائیداد اپنا پاس پڑوس چھوڑ دیا۔ دراصل جس طرح کے حالات پیدا ہوئے تھے اُسمیں کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کون ایسا بیوقوف آدمی ہو گا جو اپنے سکھ اور آسائشیں تیاگ کر جموں کی قیامت خیز گرمی میں جھلسنے کے لئے چلا جائے گا۔ تم نے کہا کہ وہ وہاں پر عیش کر رہے ہیں۔ کاش تم ایک بار اُن کیمپوں میں گئے ہوتے تو تمہیں پتا چلتا کہ وہ کیسے جیتے جی ہی جہنم کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ آج بھی اُنکی حالت بد سے بدتر ہے، پھر بھی اُنکے درد کو کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔ سب کا یہی خیال ہے کہ وہ کشمیر لوٹ کے آنا نہیں چاہتے۔ وہ تو اپنے گھر لوٹنے کے لئے اسی طرح تڑپ رہے ہیں جسطرح ایک مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ وہ بھی اپنے یار دوستوں، اپنے پاس پڑوسیوں سے ملنے کے لئے ایسے ہی تڑپ رہے ہیں جیسے تم تڑپ رہے ہو۔ تم تاریخ میں جھانک کر دیکھو گے تو پھر تمہیں پتا چلے گا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے کیوں تڑپ رہے ہیں، کیونکہ ہمارا آپس میں خون کا رشتہ ہے اور خون جب اپنا خون دیکھتا ہے تو جوش مارنے لگتا ہے۔''

سولہ کاک میری باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ اُسکے چہرے سے یہ بات صاف عیاں تھی کہ وہ اپنوں سے ملنے کے لئے بن آب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ تڑپ میں نے ہر کشمیری کے دل میں پائی ہے۔ میں نے جب اپنے آبائی گاوں میں پندرہ سال کے بعد قدم رکھا تو گاوں کا گاوں مجھ سے ملنے کے لئے اُمڈ پڑا۔ لوگ ایسے جذباتی ہو گئے کہ برسوں کی پتھرائی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ماوں نے مجھے ایسے سینے سے لگا لیا جیسے اُن کا بچھڑا لال برسوں بعد گھر لوٹ کے آیا ہو۔ یہ وہ بندھن ہے جو لاکھ کوششوں کے باوجود ٹوٹ نہیں پایا کیونکہ یہ بندھن دل کے تاروں سے جڑا ہوا ہے جسے توڑنا آسان نہیں ہوتا۔

اگلے روز جب میں زم زم ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی بدحواسی کے عالم میں میرے پاس آیا

۔پہلے تو میں ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ کیوں اور کس ارادے سے میرے کمرے میں گھسا۔اس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ پوچھ پاتا وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''صاحب میرا نام ولی محمد ہے۔میں محمد سلطان کا پڑوسی ہوں۔مطلب سولہ کا ک جس کے گھوڑے پر بیٹھ کر کل آپ یہاں پر آ گئے تھے۔اُسنے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔صاحب اُسے پولیس نے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔وہ بے قصور ہے صاحب۔آپ چل کر اُسے چھڑا لیجئے۔پولیس نے یونہی اُسے ایک جھوٹے کیس میں پھنسا لیا ہے۔اُسے پورا یقین ہے کہ آپ ہی اُسے پولیس کے چنگل سے چھڑا سکتے ہیں'' قبل اسکے کہ میں کچھ کہہ پاتا، گلزاری بیچ میں بول پڑا۔

''بھئی ہم کو اُس آدمی سے کیا لینا دینا۔ہم اُسے کیوں چھڑا لیں؟''

ولی محمد گلزاری کے اس جواب سے میرا منہ تکتا رہ گیا۔گلزاری کی اس بے رخی نے اُسے بڑا مایوس اور دکھی کر دیا۔وہ اُٹھ کے جانے لگا۔اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل جائے میں اُٹھ کر کھڑا ہوا اور اُسے روک کر میں نے اُسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ولی محمد تم نیچے جا کر میرا انتظار کر لو۔میں ابھی کپڑے بدل کر نیچے آ جاتا ہوں اور پھر ہم پولیس اسٹیشن چلیں گے۔ویسے میں یہاں کے کسی پولیس افسر کو نہیں جانتا ہوں پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

ولی محمد کے مرجھائے ہوئے چہرے پر کھوئی ہوئی اُمید لوٹ کر آ گئی۔وہ بشاش ہو کے کمرے سے نکل گیا۔اُسکے جاتے ہی گلزاری برہم ہو کے مجھ سے بولا۔

''ہمیں اس گھوڑے والے سے کیا لینا دینا ہے۔ایک تو چوری کے الزام میں گرفتار ہوا ہے اوپر سے فرمان ایسے جاری کرتا ہے جیسے ہم اُسکے غلام ہیں۔''

''لینا دینا نہ ہوتا تو وہ اس مشکل گھڑی میں مجھے ہی کیوں یاد کرتا۔کوئی نہ کوئی ایسا جذبہ ہے جو ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچتا چلا جا رہا ہے۔تم شاید ان رشتوں کو سمجھ نہیں پاوگے کیونکہ تم اپنی ذات کے اسیر ہو۔تم نے اپنی دنیا میری ذات تک ہی سمیٹ کے رکھی ہے۔ایک دن جب میں چلا جاوں گا تو تمہیں پتا

چلے گا کہ کسی کے دور ہونے سے دل میں کتنی کسک ہوتی ہے۔ کتنا درد ہوتا ہے"

وہ جز بز ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ گلزاری میں یہی ایک کمی ہے کہ وہ زندگی کی کڑوی سچائیوں سے ہمیشہ آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ وہ رشتوں کی نزاکت کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ بھرے ہوئے گلاس کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔ خالی گلاس کو دیکھنا اُسے منظور نہیں۔ مجھے وہ انسان پسند نہیں جو اپنی ذات کو اپنے ہی خول میں سمیٹ کے رکھ دے۔ جب آدمی ایک سموہ میں رہ رہا ہے تو اُسے اُس خول سے باہر آنا چاہیے، کیونکہ ہم صرف اپنی ذات سے ہی نہیں دوسروں کے دکھ و درد سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ میں کپڑے بدل کر جب نیچے آ گیا۔ ولی محمد بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔ گلزاری بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم سیدھے پولیس چوکی پہونچے جہاں سولہ کاک لاک اپ میں بند تھا۔ میرا ادبی اور فلمی پس منظر دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ جب میں نے انسپکٹر کو اپنا نام بتا دیا تو پتا چلا کہ وہ میرے نام سے بھلی بھانتی واقف تھا کیونکہ وہ اُردو ادب سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اُسنے مجھے بڑی عزت سے بٹھا دیا۔ میرے بیٹھتے ہی اُس نے ایک سپاہی کو چائے کے لئے دوڑایا۔ اُسکے جاتے ہی اُسنے مجھ سے پوچھا۔

"کہیے حضور کیسے آنا ہوا؟"

"انسپکٹر صاحب میں آپ کے پاس ایک غریب کی فریاد لے کے آیا ہوں۔ آپ نے جس غریب گھوڑے والے کو لاک اپ میں بند کیا ہے، اُسے خدارا آزاد کیجیے"

"صاحب ہم نے اُسے بلاوجہ بند نہیں کیا ہے۔ اسکے خلاف ایک ٹورسٹ نے چوری کی رپٹ لکھوائی ہے۔ چالیس ہزار کی چوری کا معاملہ ہے۔ اس معاملے کو یونہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ سولہ کاک نے چوری کی ہے۔ وہ کبھی بھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا ہے۔ وہ غریب ضرور ہے پر ایک عزت دار اور خوددار آدمی ہے۔ وہ بھوکوں مر جائے گا پر ایسی اوچھی حرکت کبھی نہیں کرے گا"

"معاف کیجیے صاحب آج آپ جس کشمیر میں بیٹھے ہیں، یہ وہ کشمیر نہیں ہے جسے آپ برسوں

پہلے چھوڑ چکے ہیں۔اس سے پہلے کبھی آپ نے سنا کہ ایک دوست چند روپیوں کی خاطر اپنے ایک ڈنٹل سرجن دوست کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ایک وحشی اپنی ہوس مٹانے کے لئے چھ سال کی بچی کے ساتھ زنا بالجبر کر کے اُسکا گلا گھونٹ کر اُسے قتل کر سکتا ہے۔آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ وادی چھوڑ کے چلے گئے۔مانا کہ گھر بار زمین جائیداد چلی گئی مگر ننگ و ناموس تو بچ گئی نا۔یہ وہی کشمیر ہے جہاں جرم نا کے برابر ہوتا تھا۔آج یہ عالم ہے کہ جرم کے معاملے میں کشمیر نے بہار جیسی بدنام ریاست کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

انسپکٹر کی باتیں تلخ سہی پر حقیقت پر مبنی تھیں۔بہت دیر تک ہم سیاسی حالات پر بحث کرتے رہے۔بعد میں میری درخواست پر اُسنے دو سپاہیوں کے ساتھ سولہ کاک کو ٹورسٹ کا بٹوہ ڈھونڈنے بھیجا۔میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ٹورسٹ کا کھویا ہوا بٹوہ مل جائے اور میرے بھروسے کی لاج رہ جائے۔اوپر والے نے میرے بھروسے کی لاج رکھ لی۔ٹورسٹ کا کھویا ہوا بٹوہ ایک جھاڑی کے پاس مل گیا۔اُسمیں پوری رقم جوں کی توں موجود تھی۔بٹوہ مل جانے کے بعد سولہ کاک کو رہا کیا گیا۔میں انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکل گیا۔ ہوٹل پہونچ کر جب میں اور گلزاری شام کو رنگین بنانے کی تیاری کر رہے تھے، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔گلزاری نے دروازہ کھولا۔سامنے سولہ کاک کھڑا تھا۔وہ دوڑ کر اندر آ گیا اور سیدھے میرے قدموں میں گرا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ہم اُس کی اس حرکت پر حیران و ششدر ہو کے رہ گئے۔اس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ پوچھ پاتا وہ خود ہی بول پڑا۔

"صاحب مجھے معاف کیجئے۔میں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔آپ نے آنکھ بند کر کے میری بے گناہی پر یقین کر لیا۔مجھے جانے پرکھے بنا مجھے ایماندار اور نیک ثابت کرنے کی کوشش کی۔سچ یہ ہے کہ میں نیک ہوں نہ ایماندار۔میں نے آپ کے اعتماد کے ساتھ چھل کیا ہے۔آپ کے بھروسے کے ساتھ فریب کیا ہے۔میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کر رہا ہے۔آپ جو چاہے مجھے سزا دیجئے۔میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کے جی نہیں پاؤں گا۔صاحب میں گناہ گار ہوں۔وہ بٹوہ میں نے ہی چرایا تھا۔میں نے ہی چوری کی تھی"

میں اُسکے اعتراف سے دم بخود ہو کے رہ گیا۔مجھے لگا کہ اپنے جرم کا اقبال کر کے واقعی اُسنے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔میں حیرت اور صدمے سے سولہ کاک کا منہ تک رہا تھا جواب تک سبک

رہا تھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا سولہ کا کا؟'' میں نے من مسوس کر پوچھا۔

اُسنے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مجھ سے گویا ہوا۔

''کیا بتاوں صاحب۔ میرا بیٹا چار دن سے میرے پیچھے پڑا تھا کہ میں اُسے موبائل خریدنے کے لئے پیسے دیدوں۔ میں نے اُسے بہترا سمجھایا کہ موبائل ہمارے کس کام کا۔ ہم تو اُن میں سے ہیں جنہیں پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے، مگر اُس کمبخت پر میرے سمجھانے کا رتی بھر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو بس ایک ہی ضد لے کے بیٹھا رہا کہ موبائل خرید کے نہیں دو گے تو بھوکوں رہ کر اپنی جان دیدوں گا۔ میری کمائی تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں، ایسے میں ننگی کیا نچوڑے کیا نہائے۔ ایک طرف بیٹے کی ضد اور دوسری طرف میری مجبوری اور بدحالی۔ کیا کروں میں۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کل آپ کو چھوڑنے کے بعد مجھے ایک ٹورسٹ مل گیا۔ میں نے جب اُسے گھوڑے پر بٹھایا اور اُسکا بیگ اپنے کاندھے پر ڈالا تو بیگ میں رکھے بٹوے پر میری نظر گئی۔ میں نے بیگ میں سے بٹوہ نکال کر اُسے ایک جھاڑی میں پھینک دیا۔ اس عندیے کے ساتھ کہ جونہی ٹورسٹ سواری کر کے ہوٹل لوٹ جائے گا میں بٹوہ جھاڑی سے نکال کر یہاں سے چلا جاوں گا۔ یہ میری بدبختی ہے کہ ٹورسٹ کو راستے میں پیاس لگی۔ اُسنے مجھ سے بیگ مانگا۔ جب وہ اپنا بٹوہ ڈھونڈنے لگا تو اُسے بٹوہ نہیں ملا۔ اُسے مجھ پر شک ہو گیا اور اُسنے پولیس والوں کو بلایا۔ پولیس مجھے پکڑ کر پولیس چوکی پر لے گئی اور مجھ سے پوچھ تاچھ کرنے لگی۔ جب میں نے جرم قبول نہیں کیا تو اُنہوں نے مجھے حوالات میں ڈال دیا۔ اگر ٹورسٹ کو اتنی جلدی پتا نہ چل جاتا کہ اُسکا بٹوہ غائب ہو گیا ہے تو میں کبھی پکڑا نہیں جاتا۔ میرا بیٹا موبائل لے کے گاوں میں گھوم رہا ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ داو ہی اُلٹا پڑ گیا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میں آپ کی مہربانی سے میں حوالات سے چھوٹ تو گیا مگر ضمیر کی عدالت سے چھوٹ نہیں پایا ہوں''

میں بڑا قلق و اضطراب محسوس کرنے لگا۔ انسپکٹر نے سچ ہی کہا تھا کہ میں جس کشمیر کو برسوں پہلے چھوڑ کے گیا تھا یہ اب وہ کشمیر نہیں رہا۔ میرا کشمیر بڑا شدھ اور پاک تھا۔ جرم، غلاظت، فریب اور دھوکہ

دھڑی سے پاک۔ یہ آج کا کشمیر میرا وہ کشمیر نہیں ہوسکتا جہاں لوگ کچے اور گھاس پھوس کے مکانوں میں بھی خوش رہا کرتے تھے۔ جو آدھی روٹی کھا کے بھی مست رہتے تھے۔ نہ کوئی بیماری، نہ کوئی تناو۔ آج کے کشمیر میں ایک اندھی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ دیا نہ مروت، شرم نہ حیا، نہ چھوٹوں کی چھٹائی اور نہ بڑوں کی بڑائی کا لحاظ۔ جسطرح بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے نظر آتے ہیں اسی طرح متوسط طبقے کو صرف پیسہ ہی پیسہ نظر آتا ہے۔ یہ پیسہ جس راستے سے بھی آجائے، جائز ہے۔ اس اندھی دوڑ میں ہم نے بہت کچھ کھو دیا سب سے پہلے ہم نے انسانی قدروں کو کھو دیا۔ ہم نے مقدس رشتوں کو کھو دیا۔ بنگلوں، کاروں اور موبائلوں کی چاہ اور چکا چوندھ میں ہم نے اپنا چین وسکون، خوشی ومسرت، آرام و فرحت سب کھو دیا۔ بدلے میں کیا پایا۔ درد وغم، رنج ومحن، ذہنی انتشار، اختلاج قلب، ہائی بلڈ پریشر ذیابیطیس اور نہ جانے کون کون سی بیماریاں۔ عیش وعشرت کی چاہ میں ہم نے کھویا بہت کچھ اور پایا بہت کم۔

میرا دل آج بھی اُس کشمیر کو دیکھنے لئے تڑپ رہا ہے جس کا پانی ٹھنڈا اور شیتل ہوا کرتا تھا۔ جسکی ہوائیں صاف وپاک ہوا کرتی تھیں۔ جہاں کی فضا کبھی آلودہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ جہاں لوگ امن وآشتی کی زندگی گزارتے تھے۔ جہاں محلے ایک کنبے کی طرح اور موضع ایک سموہ کی طرح ہوا کرتے تھے۔ جہاں دکھ سکھ سانجھے ہوا کرتے تھے۔ جہاں اگر ایک بے زبان پنچھی مارا جاتا تھا تو لوگ تراہ تراہ کر اُٹھتے تھے۔ میں اُس کشمیر کو کہاں تلاش کروں جو کنکریٹ کے اس جنگل کے نیچے دفن ہو چکا ہے۔

## نار ملنگ

کشمیر صوفی سنتوں کی نگری رہی ہے۔اسے کچھ لوگ پیر فقیروں کی پھلواری بھی کہتے ہیں۔یہ سچ ہے کہ صوفی کلچر کا یہاں کے ماحول پر کافی گہرا اثر رہا ہے۔یہاں ایسی عظیم روحانی ہستیوں نے جنم لیا ہے جن کے عقید تمندوں میں کبھی کوئی بھید بھاو دکھائی نہیں دیا۔ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی ان ولیوں اور رشیوں کو صدیوں سے اُسی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں جسطرح اُنکے پیروکار اُنکا احترام کرتے آئے ہیں۔اس وادی کا یہ خاصا رہا ہے کہ یہاں مذاہب جدا سہی مگر یہاں کی قدریں مشترک رہی ہیں۔ہم جس گنگا جمنی تہذیب کی جب بھی بات کرتے ہیں، اُسکی اصلی تصویر اگر دیکھنی ہو تو کشمیر سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی جہاں شیخ نور الدین ولی ہو یا ہو یا ماتا للیشوری انہیں ماننے والوں میں مسلمان ہی نہیں ہندو بھی پیش پیش رہے ہیں۔فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ہندو کے لئے شیخ نور الدین ولی نندرشی ہے جب کہ مسلمان کے لئے لل دید، لل عارفہ ہے۔کسی بھی فرقے کا کوئی بھی فرد ہو جب بھی ان ولیوں اور رشیوں کا نام لیتا ہے تو انتہائی تعظیم واحترام سے لیتا ہے۔اُسکی سوچ کیسی بھی ہو مگر جب ان عظیم ہستیوں کا زکر ہوتا ہے تو اُسکا سر خود بخود تعظیم وتکریم سے جھک جاتا ہے۔

اسی کشمیر میں ایک ملنگ تھا جو نار موت کے نام سے مشہور تھا۔موت ایک کشمیری لفظ ہے جسے کئی معنوں میں استمال کیا جاتا ہے۔عام اصطلاح میں موت کا مطلب سنکی ہوتا ہے، مگر اس لفظ کو ضدی، دیوانے، ہٹیلے یا ملنگ کے لئے بھی استمال میں لایا جاتا ہے۔چونکہ وہ اپنے حال سے بے خبر تھا اسلئے اُسے ملنگ ہی کہا جاسکتا تھا۔نار موت؟ نار یعنی آگ اور موت یعنی ملنگ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔بات یہ تھی کہ وہ اپنے بائیں کاندھے پر ایک مٹی کا کونڈا لے کر گھومتا تھا جسمیں ہر دم انگارے دہکتے رہتے تھے۔اس آگ کی تاپ نے اُسکے کاندھے کو اس حد تک جلا کے رکھ دیا تھا کہ اندر کی چربی پگھل پگھل کر باہر آچکی تھی۔ یہ آگ ہی اُسکی پہچان بن کر رہ گئی تھی۔نار موت کے نام سے یہاں کا بچہ بچہ واقف تھا۔وہ اس گاوں کے اور ے دھورے میں جب دیکھو ڈنڈے بجاتا پھرتا رہتا تھا۔صبح سے لے کے شام تک وہ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔پھر اتنا غفیل ہو کے کہیں کسی کونے کھدرے میں پڑا رہتا تھا۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ برسوں سے اس گاوں میں گھوم رہا تھا پھر بھی اُسکے آگا پیچھا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ طرفہ یہ کہ کسی کو اُسکا اصلی نام تک معلوم نہ تھا۔ وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا اسکے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اُسے ہندو بھی مانتے تھے اور مسلمان بھی مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ ہندو اُسے مسلمان سمجھتے تھے جب کہ مسلمان اُسے کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ بہر حال وہ کون تھا کیا تھا اس بات سے کسی کو کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اُنکے لئے تو وہ ایک ملنگ تھا ، ایک روحانی ہستی اور اس ملنگ کی نہ صرف انہیں پرواہ تھی بلکہ وہ اسکے معتقد اور قدردان بھی تھے۔ اُنہیں اسکے اندر کسی روحانی ہستی کا پرتو دکھائی دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا ہر کوئی اُسکی عزت و تکریم کیا کرتا تھا۔ کچھ عورتیں تورات کے اندھیارے میں اُسے گھیر لیتی تھیں اور پھر اُسکے منہ کی لال پونچھ کر وہ کپڑا تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں اس یقین کے ساتھ کہ اُنکے دکھ ودرد دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ بات عام ہوگئی تھی کہ وہ بڑا پہونچا ہوا ملنگ ہے اور جو بھی سچی نیت کے ساتھ اُس کے پاس جاتا ہے اُسکے من کی مراد پوری ہوتی ہے۔

وہ جب سے اس گاوں میں نمودار ہوا تھا، تب سے وہ یہاں کے ہر فرد و بشر کو ایک ہی پہناوے میں نظر آیا، وہ تھا اُسکا کالے رنگ کا پھرن جو اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اب اُسمیں لیرے لگے تھے۔ سر پر بال ایک بھی نہ تھا اور بنا بال کے اُسکا سر تانبے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ اُسکی میلی کچیلی داڑھی میں جو ادھ کچی ادھ پکی تھی اُس پر ناک سے بہنے والی رطوبت اس طرح بیٹھ گئی تھی جیسے گندے پانی پر جمی ہوئی کائی۔ سب سے متحیر کن بات یہ تھی کہ بائیں طرف کے کاندھے پر وہ جو دہکتا ہوا مٹی کا کونڈا لے کر گھومتا تھا اُسے وہ ایک پل بھی اپنے آپ سے الگ نہیں کرتا تھا۔ اس برتن کی تاپ نے اُسے اس حد تک نقصان پہونچایا تھا کہ اُسکے اندر کا مانس صاف دکھائی دیتا تھا اور اس گوشت میں سے پگھلی ہوئی چربی کی دھار کھوپرے کے تیل کی طرح نیچے گرتی ہوئی صاف صاف نظر آتی تھی پھر بھی وہ اس کونڈے کو اپنے آپ سے الگ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ سچ مچ کوئی پہونچا ہوا ملنگ تھا جسے دیکھ کے ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگ اُسکی ہیبت کزائی دیکھ کر اُسکے کاندھے سے وہ برتن ہٹانے کی جب بھی کوشش کرتے تھے تو وہ غیض و غضب میں آجاتا تھا اور

لوگوں کو پھٹ پھٹ دردر کر کے بھگاتا تھا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اُسے اپنی کوئی سدھ ہی نہیں تھی۔ اُسکا بدن گھلتا جا رہا تھا، پھر بھی وہ بےفکر ہو کے گھوم رہا تھا۔ اُسے تو اپنی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ وہ تو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہا تھا جسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ ہی جینے مرنے کی پرواہ۔ اُسے انسانوں سے زیادہ کتوں سے پیار تھا۔ وہ جب بھی کسی چھتنار پیڑ کے سایے میں چند لمحوں کے لئے ستانے کے لئے بیٹھ جاتا تھا تو گلی محلے کے سارے آوارہ مریل کتے اُسکے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہ اُسے دیکھ کر بھونکتے نہیں تھے بلکہ اُسے چاٹنے لگتے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ایسے گھل مل جاتا تھا جیسے وہ بھی ایک کتا ہی ہو۔ جتنے بھی پرہیز گار تھے وہ اُس سے بچ کے نکل جاتے تھے۔ اُنہیں یہ کھٹر کا لگا رہتا تھا کہ اگر وہ انہیں چھو گیا تو وہ نجس ہو جائیں گے اور اُنکی نماز قضا ہو جائے گی۔ کچھ رحمدل بھی تھے جو گھر سے اُسکے لئے کھانا لے کر آتے تھے اور اُسکے سامنے رکھ کر چلے جاتے تھے۔ وہ اکیلے نہیں کھاتا تھا بلکہ جتنے بھی کتے اُس سے لپٹے ہوئے ہوتے تھے وہ بھی اُسی برتن میں منہ مارتے تھے۔ اُسے کتوں کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ ان بے زبانوں کو اپنے ساتھ کھاتے دیکھ کر وہ بڑا نہال ہو جاتا تھا۔

میری ماں فطرتاً بڑی ہی سہل اعتقاد اور خداترس عورت تھی۔ وہ جب بھی نارملنگ کو دیکھتی تھی تو اُسکی حالت دیکھ کر اُسکا دل بھر آتا تھا۔ وہ اُسے ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے آتی تھی۔ اُسے گھر کی چوکھٹ پر بٹھاتی تھی پھر اُسکے لئے کھانا لے کر آتی تھی۔ اُسکے پہلو میں بیٹھ کر وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھی۔ جب کھانا کھاتے ہوئے اُسکے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی تو اماں کسی صاف کپڑے سے اُسکا منہ پونچھ لیتی تھی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ بس احسان مند آنکھوں سے اماں کی طرف ایسے ہی دیکھتا تھا جیسے ایک شیر خوار بچہ دودھ پیتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ اماں بڑا جذباتی عورت تھی۔ اُسے یوں دیکھ کر اُسکی ممتا کے ساگر چھلکنے لگتے تھے۔ وہ اُسکے سر پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ اُسکے زخموں کو سہلانے لگتی تھی۔ وہ دانت نکوسے اماں کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔

عورتوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ عورتیں بڑی ہی سہل اعتقاد اور توہم پرست ہوتی ہیں۔ میری اماں بھی اُسی زمرے میں آتی تھیں۔ وہ پیر فقیر، سادھو سنتوں کو بہت مانتی تھیں۔ کوئی دور سے

بھی صدا لگا دیتا تھا تو اماں فوراً کچھ نہ کچھ، رزق روٹی لے کر بھاگ کے دروازے پر پہونچ جاتی تھیں اور فقیر کی جھولی بھر دیتی تھیں۔ ہم اماں کو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آچکے تھے کہ ان خرقہ پوشوں کے پیچھے زیادہ دوڑ امت کر۔ ان میں سے بیشتر ٹھگ اور جھپٹ مار ہوتے ہیں۔ آئے دن جو ٹھگی کی وارداتوں کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں ہم یہ خبریں اماں کو پڑھ کر سناتے تھے۔ ہمیں لگتا تھا کہ یہ خبریں سن کر اماں کچھ خوف کھائیں گی اور اُسکا موہ ان پیر فقیروں کے تیئں بھنگ ہو جائے گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔ وہ تو ان باتوں کا ایک کان سے سنتی تو دوسرے کان سے اُڑاتی تھیں۔ وہ تو بھگتی کے رنگ میں ایسی رنگ چکی تھیں کہ اُسے ہر سادھو سنت اور پیر فقیر میں رب کا جلوہ نظر آتا تھا۔

اماں دھرم کرم کے معاملے میں بڑی ہی قدامت پسند سوچ رکھتی تھیں۔ وہ اتنی کٹر تھیں کہ کسی کے ہاتھ کا چھوا پانی تک نہیں پیتی تھیں۔ ہمارے گھر میں غیر ہندوں کو اس بات کی مناہی تھی کہ وہ بھولے سے بھی کبھی اماں کے چوکے میں پاوں نہ رکھیں۔ مگر جب نار ملنگ آجاتا تھا تو اماں کے سارے اصول طاق نسیاں ہو جاتے تھے۔ وہ کٹر پسندی کے خول سے نکل کر ایک نئے روپ میں نظر آتی تھیں۔ چھوا چھوت، بھید بھاو یہ سب فلسفے دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔ جب ایک عورت ماں کا روپ دھارن کر لیتی ہے تو نفرت، تعصب، کٹرپن کی ساری دیواریں خود بخود منہدم ہو جاتی ہیں۔ اصل میں اماں اندر سے بڑی کمزور تھیں۔ کمزور آدمی ہمیشہ دوسروں کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔ وہ سہارا چاہے خدا کا ہو یا کسی پیر فقیر کا۔ اماں بھی ہم سب کی خیر و برکت کے لئے آستانوں اور مزارعوں پر دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ جب بھی وہ کسی آستانے کے سامنے سے گزرتیں تو جا کر ماتھا ٹیک لیتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ کسی مزار کے باہر پڑے پتھر کو بھی سلام کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ مانے تو ایشور نہیں تو پتھر۔ وشواس سب سے بڑی چیز ہے۔ اگر آدمی کسی پتھر سے بھی اپنی مراد پالے تو وہ اُسے بھی خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔

سب کچھ حسب دستور چل رہا تھا۔ اچانک وادی میں بھونچال سا آگیا۔ آسمان میں سیاہ بادل منڈھلانے لگے۔ ایسی آندھی چلی جس نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ خرمن سکون میں چنگاری کیا پڑی کہ سب کچھ جل کر راکھ ہونے لگا۔ کشمیر جو ایک وقت امن و شانتی کی آماجگاہ مانا جاتا تھا یکایکی آگ کے

شعلوں میں جھلسنے لگا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ اس افراتفری میں شہر کے لوگ اپنی جان بچانے کی خاطر یہاں سے وہاں بھاگنے لگے۔ آئے دن کرفیو اور ہڑتالیں معمول کی باتیں بن کر رہ گئیں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جونہی شورش پھیلنے لگی تو نار ملنگ گاوں میں خال خال ہی نظر آنے لگا۔ جونہی حالات بہت زیادہ ابتر ہونے لگے تو نار ملنگ جیسے زمین دوز ہو گیا۔ وہ کسی کو بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ لوگوں نے یہی قیاس لگا لیا کہ شاید وہ بھی کسی کراس فائرنگ یا کسی بم دھماکے میں مارا گیا ہو۔ اماں تو ہر پل ہر گھڑی اُسے یاد کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ رات کے وقت یکا یک اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور پھر بے تحاشہ دروازے کی طرف بھاگ کر نار ملنگ کو آواز دینے لگتی تھیں۔ باہر دیکھتی تو وہاں سناٹے کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہم اماں کی ان حرکتوں سے جل بھن کے رہ جاتے تھے۔ اماں کو اپنی پرواہ نہ تھیں۔ وہ نار ملنگ کے لئے مری جا رہی تھیں۔

اسی بیچ ہمارے فرقے کے بیشتر لوگ نقل مکانی کرنے لگے۔ جب ایک گلے میں سے ایک بھی جانور ادھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے تو پورے ریوڑھ میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ یہی حال ہمارے قوم کے ساتھ ہوا۔ ایک کے بعد ایک ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے پورے سموادائے میں کھلبلی مچ گئی۔ ہم بھی گھبرا گئے۔ فیصلہ یہی ہوا کہ ہم بھی یہاں سے چلے جائیں۔ جب یہ بات اماں کو بتائی گئی تو وہ اڑ گئیں۔ بولیں۔ میں اپنا گھر بار چھوڑ کے کہیں نہیں جاوں گی۔"

ہم نے اماں کو سمجھانے بجھانے کی کی بہترا کوشش کی۔ ہماری باتوں کا تو اماں پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔ وہ تو کسی بھی حال میں اپنا گھر چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ ایکطرف ہماری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف اماں کی ضد۔ اب اماں کو کون سمجھائے کہ اب اس شہر کی زمین ہمارے لئے تنگ ہو چکی ہے۔ اب ہمارا یہاں رہنا اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف تھا۔ اماں کے منع کرنے کے باوجود ہم نے اپنا گھر بار کو چھوڑ کے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات اس حد تک کشیدہ ہو چکے تھے کہ ہمیں رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح نقل مکانی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

گھر سے بچھڑ جانا کتنا اذیت ناک اور جان گسل ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں مہاجر بن کے جینا پڑا ہو۔ اپنے کاشانے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ جا کے رہنا ایسا ہی ہے جیسے ایک ہرے

بھرے پیڑ کو اُکھاڑ کر کسی اور جگہ لگا دیا جائے۔ ہم بھٹکتے بھٹکتے دلی پہونچ گئے۔ دلی میں ایک کرایے کے مکان میں ہم منتقل ہو گئے۔ چودہ کمروں کا گھر چھوڑ کر ہم اب دو کمروں میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ اماں سے یہ جدائی سہی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی تھیں۔ اُسنے ایک طرح سے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ ہم سب لوگ اُسے قسمیں دیتے، اُسکے سامنے گڑگڑاتے تب جا کے وہ دونوالے زہر مار کر کے کھالیتی تھیں۔ دھیرے دھیرے اُسکی صحت بگڑنے لگی۔ جسم پیلا پڑنے لگا۔ نظر کمزور ہونے لگی۔ نقاہت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ اپنے بوتے کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ اُسے باتھ روم تک لے جانے کے لئے بھی کسی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ میں اُسے باتھ روم تک لے تو گیا مگر جب وہ باتھ روم میں گھس گئی تو چکنے فرش پر اُسکا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے گری۔ نہ صرف سر میں گہری چوٹ لگی بلکہ کئی ہڈیاں بھی ساتھ میں چٹخ گئیں۔ ہم اُسے بمشکل تمام ہاتھوں پر اُٹھا کر باہر لے آئے اور پھر اسٹریچر منگوا کر اسپتال لے گئے۔ اُسکو فوراً ایمرجینسی وارڈ میں بھرتی کیا گیا۔ ایک طرف اُسکے منہ پر آکسیجن ماسک لگا دیا گیا دوسری طرف اُسکی ٹانگوں پر پلاستر چڑھایا گیا۔

وہ ایک ہفتے تک کوما میں رہی۔ اُسکی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اماں اب گئی کہ تب گئی۔ ایک ہفتے کے بعد اُسے ہوش آیا۔ ہوش آنے کے بعد وہ نہ روئی نہ درد سے کراہی۔ وہ تو بس ایک زندہ لاش کی طرح اپنے بیڈ پر پڑی رہی۔ وہ اسپتال میں ایک مہینے تک پڑی رہی۔ اس ایک مہینے میں کسی نے اُسکے منہ سے ایک بول نہ سنا۔ وہ یا تو خاموش رہتی تھی یا آنکھیں بند کر کے پڑی رہتی تھی۔ ہمیں لگا شاید وہ درد کی شدت کی وجہ سے بول نہیں پا رہی ہے۔ جب ہم اُسے گھر لے آئے تو ہم یہ آس لگا کے بیٹھے تھے کہ جب وہ ناطے پوتوں سے ملے گی تو خود بخود بولنا شروع کر دے گی مگر یہاں بھی اُسکی چپی بنی رہی۔ ہم اُس سے بات کرتے تو وہ ایسے ٹکر ٹکر کے دیکھتی تھیں جیسے ہم سب اُسکے لئے اجنبی ہوں۔ وہ اب ایک زندہ لاش کی طرح تھیں۔ نہ منہ سے بولتی تھیں نہ سر سے کھیلتی تھیں۔ اُسکی یہ چپی ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ ہم متوش ہو کر ڈاکٹر سے ملے اور اُس سے اس بارے میں بات کی تو اُس نے یہ کہہ کر ہماری چنتا دور کرنے کی کوشش

کی کہ چونکہ اُسکے سر پر گہری چوٹ لگی ہے اسلئے اُسے نارمل ہونے میں وقت لگے گا اسلئے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے ہماری تشویش اور بڑھ گئی۔ ہم اماں کو یوں چپ ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جو عورت ایک پل بھی چپ نہیں رہتی تھیں وہی ایسے خاموش ہوگئی تھیں جیسے کوئی بجتا ہوا ساز اچانک خاموش ہوجائے۔

جب سے وہ اسپتال سے لوٹی تھیں میں اُسکے کمرے میں اُسکے پاس سویا کرتا تھا۔ کیا پتا کہیں رات کو باتھ روم جانے کی ضرورت پڑ جائے تو بنا سہارے کے کیسے جاپائے گی۔ سونے سے پہلے میں اُسکے پاوں دبایا کرتا تھا اور تب تک دباتا رہتا تھا جب تک اُسکی آنکھ نہیں لگ جاتی تھی۔ ایک رات کیا ہوا کہ مجھے دروازے پر کسی کی دستک سنائی دی۔ میں تیزی سے اُٹھا اور دروازہ کھول کے دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں غصے سے دروازہ بند کر کے جب پلٹا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اماں میرے پیچھے کھڑی تھی۔ جو بغیر سہارے کے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا پاتی تھیں وہ میرے سامنے تن کر کھڑی تھیں۔

''اماں تم۔ تم خود کھڑی ہوسکتی ہو؟'' حیرت و مسرت کے ملے جلے احساس سے میں نے اُس سے پوچھا۔

''وہ آ گیا تھا۔ وہ آ گیا تھا'' وہ بدقت تمام بولیں

''کون آ گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نار ملنگ۔ وہ نار ملنگ تھا وہ مجھے لینے کے لئے آیا تھا میرے بیٹے۔ میں نے خود اُسکی آواز سنی۔ وہ مجھے بلا رہا تھا''

اب کے مجھے غصہ آیا اور میں اماں پر بگڑ کر بولا۔ ''اماں تمہارے کان بج رہے ہیں۔ باہر کوئی نہیں ہے۔ جا کے دیکھو کیسے موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے ہر سو اور تم ہو کہ نار ملنگ کے سپنے دیکھ رہی ہو۔ برا ہو اس ڈھونگی ملنگ کا جس نے تمہارا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ تمہارا نار ملنگ جسے دیکھ کر گھن آتی تھی ایک نمبر کا بہروپیہ تھا۔ ہم پہلے بھی تم کو سمجھا چکے ہیں کہ ان ڈھونگیوں کے فریب میں مت پڑو۔ اگر وہ اتنا ہی پونچھا ہوا ملنگ تھا تو یوں لاپتا نہیں ہو جاتا۔ جس دن سے کشمیر میں شورش شروع ہوئی اُس دن سے وہ نابود

ہو گیا ہے۔ آج تک کسی کو اُسکی بو باس تک نہیں ملی، ایک تم ہو جو اب تک اُسکی آس میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہو۔ بھول جاؤ اُسے۔ وہ اگر زندہ بھی ہو گا تب بھی یہاں تک نہیں پہونچ پائے گا۔"

میری باتیں سن کر وہ ایک دم بجھ سی گئی۔ اُسکی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے لشتم پشتم اپنے بیڈ تک چلی گئی اور پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ اُسکی آنکھوں سے بلا کی مایوسی اور کرب صاف جھلک رہا تھا۔

اگلے روز سے اُسنے پھر چپی سادھ لی۔ دن بھر وہ بڑی اُداس رہی۔ مجھ سے تو وہ بیحد خفا تھیں ۔ مجھے دیکھتے ہی اُسکے چہرے کے تاثرات بدل جاتے تھے۔ شاید کل رات جو میں نے اُس سے کہا تھا وہ باتیں اب تک اُسے چبھی جا رہی تھیں۔ میں اندر سے پشیمان تھا مگر میں بھی کیا کرتا۔ اماں کی حرکتیں اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔

اگلے روز اماں کا پارہ دن بھر چڑھا رہا۔ دن بھر وہ بس جلبلاتی ہوئی نظر آئی۔ مجھ سے تو وہ بیحد خفا تھی۔ میری طرف دیکھنا بھی اُسے گوارہ نہ تھا۔ میں جب اُسکے سامنے بیٹھتا تھا تو وہ اپنا منہ دوسری طرف پھر لیتی تھیں۔ گھر چھوڑنے کے بعد اماں بڑی چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ کل میرے سمجھانے کے بعد وہ اور زیادہ تنک ہو گئی تھیں۔ رات کو جب میں اُسکے پاوں دبانے کے لئے آگے بڑھا تو اُسنے مجھے پاوں چھونے سے بھی منع کر دیا۔ اماں کے اس رویے سے مجھے قطعی کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں جا کے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی میری آنکھ لگ بھی نہیں پائی تھی، کہ کسی نے زور زور سے باہر کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ میں جھلا کے اُٹھا اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے خشم سے دروازہ کھولا تو باہر کا منظر دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میرے سامنے نار ملنگ کھڑا تھا۔ یہ میرا وہم نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت تھی۔ وہ اُسی رنگ و روپ اور اُسی شکل میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں حیران و ششدر اُسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ یہاں میرا یہ حال تھا وہاں اماں کے بے جان جسم میں یکا یکی جان آ گئی تھی اور وہ بھاگ کر اُسکے پاس گئی اور اُسے سینے سے لگا کر اُسکے منہ کو چومنے لگی۔ وہ حسب عادت اپنے دانت نکوسے اماں کے سینے سے ایسے لگا رہا جیسے وہ ماں کی بانہوں میں پہونچ گیا ہو۔ اماں اُسے اندر لے

آئی اور پھر میری طرف غصے سے دیکھ کر بولی۔

''اچھی طرح دیکھ لے اسے۔یہی ہے میرا نار ملنگ۔''

ایکطرف میں حیرت واستجاب کے سمندر میں غوطے کھارہا تھااور دوسری طرف میں اپنے کہے پر پشیمان بھی ہوئے جارہا تھا۔ایکطرف یہ سب کچھ ایک ڈراونے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔نار ملنگ جو کشمیر میں رہتا تھا، دلی کسطرح پہونچ گیا۔اُسے کہاں سے ہمارے گھر کا پتہ مل گیا۔کس نے اُسے یہاں تک پہونچادیا۔یہ ایک معمہ تھا جسے حل کرنا میرے لئے آسان نہ تھا۔اماں تو نار ملنگ کو دیکھ کر سب کچھ بھول چکی تھیں۔اُسکی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جیسے آپ ہی آپ جڑ گئیں تھیں۔اُسکا سارادکھ ودرد چھومنتر ہو چکا تھا۔وہ تو ایکدم تروتازہ ہوگئی تھی۔وہ بھاگ کر کچن میں چلی گئی اور وہاں سے کھانا نکال کر لے آئی اور پھر بڑے پیار سے نار ملنگ کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی۔میں مبہوت کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔اتنے میں گھر کے باقی لوگ بھی جاگ گئے۔وہ بھی نار ملنگ کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔

وہ کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک اماں کے پاس بیٹھا رہا۔اماں اُسے لاڑ کرتی رہی۔پھر آدھی رات کے قریب وہ ایک دم کھڑا ہو گیااور پھر کسی سے کچھ کہے بنا تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔میں اُسکے پیچھے ہولیا تا کہ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اُسکی رہنمائی کرسکوں مگر وہ باہر نکلتے ہی ایک دم غائب ہوگیا۔میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھراُدھر دیکھنے لگا۔مجھے اندھیرے میں اُسکی گرد تک نہ ملی۔میں اُلٹے قدموں سے واپس لوٹا تو گھر قدم رکھتے ہی مجھے رونے کی آواز سنائی دی۔میرا دل دھک سے ہوگیا۔گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔اماں اپنے نار ملنگ کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی تھی اور اپنا بے جان جسم ہمارے لئے چھوڑ گئی تھی۔

یہ معمہ ہمارے لئے ہنوز معمہ بنا ہوا ہے کہ نار ملنگ اصل میں تھا کون۔؟

☆☆

# نقب زن

اُسکا اصل نام حیدر خان تھا مگر اس نام سے اُسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ وہ حیدر پہلوان کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ پہلوانی سے اُسکا دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا پھر بھی یہ لاحقہ اُسکے نام کے ساتھ لگ گیا تھا۔ اصل میں ہوا کیا تھا کہ ایک بار وہ گاوں کے کھلے میدان میں سویرے سویرے کسرت کرنے پہونچ گیا۔ چند منچلوں نے جب اُسے پہلوانوں کی طرح کسرت کرتے دیکھا تو اُنہوں نے اُسے چڑانے کے لئے پہلوان کا نام لے لے کر پکارا۔ بس وہ دن اور آج کا دن یہ نام اُسکی ذات سے ایسے چپک گیا کہ لوگ اُسکا اصلی نام بھول گئے اور اُسے اسی نام سے جاننے پہچانے لگے۔

حیدر پہلوان ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس علاقے کے جتنے بھی بدمعاش تھے وہ حیدر پہلوان کو اپنا اُستاد مانتے تھے۔ چوری چکاری یا نقب زنی میں اُسکا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آج تک اُسنے سینکڑوں وارداتوں کو اکیلے ہی انجام دیا تھا۔ چوری کی واردات پولیس میں درج کرائی جاتی تھی۔ سب سے پہلے پولیس کی نگاہ میں حیدر پہلوان آجاتا تھا۔ وہ اُسے پکڑ کے لے آتے تھے اور پھر اُسے خوب کوٹتے پیٹتے تھے۔ وہ بھی سخت جان تھا چار چوٹ کی مار کھا کے بھی اپنا جرم قبول نہیں کرتا تھا۔ مال مسروقہ برامد ہونے کے باوجود وہ عدالت سے چھوٹ جاتا تھا اور پولیس کف افسوس مل کے رہ جاتی تھی۔

حیدر پہلوان اپنی سیاہ کاری کی وجہ سے خاصا بدنام تھا۔ وہ سیاہ کردار کا ہی نہیں سیاہ شکل وصورت کا بھی مالک تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اُسکے بدن پر اُلٹا توا پھیر دیا گیا ہو۔ وہ دکھنے میں ایک دبلا پتلا، مریل، مرگھلا سا آدمی لگتا تھا۔ مگر سچ یہ تھا کہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود اُسکے دم خم کا کوئی جواب نہیں تھا

۔بیسیوں بار پولیس نے ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے اُسے پیٹا۔ڈنڈے ٹوٹے۔لاٹھیاں پست ہوئیں مگر وہ پست نہیں ہوا۔ایسا لگتا تھا جیسے اُسکی ہڈیوں میں گودے کی جگہ سیسا بھرا ہو۔پولیس لاٹھیاں مارتے مارتے بے دم ہو جاتے تھے مگر حیدر پہلوان کو زراسا بھی درد نہیں ہوتا تھا۔اُسنے اپنے بدن کو اتنا مظبوط اور فولادی بنا لیا تھا کہ بڑے بڑے سورما اُسکے آگے پانی بھرتے ہوئے نظر آتے تھے۔وہ اپنے آپ کو چست و درست رکھنے کے لئے وہ ہر صبح چھ انڈے اور شام کو دو کلو گائے کا شدھ دودھ پی لیا کرتا تھا۔دن میں اُلو کی طرح بیشتر وقت اوندھے منہ پڑا رہتا تھا۔رات ہوئی نہیں کہ اُسنے لنگوٹ باندھا اور اپنے کام پر نکل گیا۔

آل نہ اولاد، ماں نہ باپ۔وہ ایکدم اکیلا اور تنہا تھا۔کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔وہ اب پیشہ ور مجرم بن چکا تھا۔ چوری چکاری کو اُس نے زریعہ معاش بنا لیا تھا۔باہر سے وہ جتنا شانت اور کم گو نظر آتا تھا باطن سے وہ بڑا غصیلا اور تندمزاج تھا۔زراسی بات اُس سے اُٹھائی نہیں جاتی تھی۔اُس نے اس علاقے میں ایسی دہشت اور دبدبہ بنا کے رکھا تھا کہ کوئی اُسکے خلاف منہ کھولنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اب تک وہ قانون کی مار سے بچتا پھر رہا تھا کیونکہ کوئی بھی اُسکے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔عام لوگ اس مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ جب پانی میں رہنا ہو تو مگرمچھ سے بیر کیوں رکھا جائے ۔حیدر پہلوان مگرمچھ سے بھی زیادہ موذی اور گیا گزرا آدمی نہیں فطرت سے بڑا کینہ پرور اور خسیس آدمی تھا۔مخالفت کرنے والوں کو وہ آسانی سے نہیں بخشتا تھا۔ایک بار جس سے مخاصمت ہوگئی اُسے وہ معاف نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے برباد کرکے چھوڑتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اُسکا کوئی دوست ورفیق نہیں تھا۔شاید اس ڈر سے کہ سانپ کی دوستی دشمنی سے مہنگی پڑتی ہے۔

حیدر پہلوان کے چوری کرنے کا طریقہ بڑا انوکھا اور نرالا تھا۔وہ پہلے دوتین بار اُس گھر کا بھرپور جائزہ لیتا تھا جو اُسکے نشانے پر ہوتا تھا۔واردات کے روز وہ اپنے بدن پر سرسوں کے تیل کی خوب مالش کیا کرتا تھا۔اس تیل مالش کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک تو جسم میں چستی پھرتی آجاتی تھی۔دوم یہ کہ اگر کہیں مکینوں کی آنکھ کھل گئی اور اُس کو پکڑنے کی کوشش کی گئی تو وہ گرفت میں نہ آسکے۔یہ پہلوانی داو تھا۔ایک پہلوان اگر دوسرے کو جکڑ کر رکھنے کی کوشش کرے تو وہ زیادہ دیر تک اُسے اپنی جکڑ میں باندھ کے نہیں رکھ

پائے گا۔ وہ مچھلی کی طرح اُسکی پکڑ سے نکل جائے گا۔ حیدر پہلوان اسی فارمولہ کی وجہ سے آج تک چوری کرتے ہوئے کبھی پکڑا نہ گیا تھا۔

اپنی اس تیس سالہ زندگی میں اُسنے درجنوں چوری کی وارداتیں انجام دی تھیں۔ وہ سیندھ اُن ہی گھروں میں لگاتا تھا جہاں خوب روپیہ پیسہ ہو۔ اب تک وہ ہزاروں روپیہ لوٹ چکا تھا مگر خدا کی کرنی دیکھئے۔ چوری کے ایک ہفتے بعد اُسکی جیب خالی ہو جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ کنوئیں کی مٹی کنوئیں کو ہی لگتی ہے۔ یہی حال حیدر پہلوان کا تھا۔ گھر میں برکت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بدبختی کا ایسا عالم تھا کہ سونے کو ہاتھ لگاؤ تو مٹی ہو جاتا تھا۔ ان سب حکایتوں کے باوجود حیدر پہلوان متواتر چوریاں کرتا رہتا تھا کیونکہ اس کام کے سوا اُسے اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔

پچھلی دفعہ اُسنے نور علی کے گھر میں سیندھ لگائی تھی۔ نور علی اسی گاؤں میں رہتا تھا جہاں حیدر پہلوان رہتا تھا۔ نور علی کے گھر میں جو کچھ تھا اُس پر حیدر پہلوان نے ہاتھ صاف کر لیا تھا۔ روپے پیسے زیور گہنے وہ سب چرا کر لایا تھا۔ یہاں پر اُس سے ایک بھول ہوئی۔ نور علی کی ایک صدری دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ حیدر پہلوان لالچ کر بیٹھا۔ اُسے یہ صدری اتنی بھا گئی کہ وہ اُسے کھونٹے سے اُتار کر اپنے ساتھ لے آیا۔

نور علی نے پولیس میں چوری کی رپٹ درج کرائی۔ پولیس لیت ولیل سے کام لیتی مگر نور علی گاؤں کے مقدم کو گھیر گھار کر اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ مقدم کا اپنا دبدبہ تھا۔ پولیس حرکت میں آ گئی اور علاقے کے سبھی بدمعاشوں کی دھر پکڑ شروع ہو گئی۔ شام ہونے تک پولیس ایک درجن کے قریب بدمعاشوں کو پکڑ کر تھانے میں لا چکی تھی۔ ان میں حیدر پہلوان بھی شامل تھا۔ تین دن تک خوب تفتیش ہوئی مگر سارے حربے آزمانے کے باوجود پولیس کے ہاتھ کوئی سراغ نہ لگا۔ چاروناچار پولیس کو سبھی بدمعاشوں کو آزاد کرنا پڑا۔ نور علی نے تھانے میں جا کر خوب ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پولیس اُسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ شک کے بنا پر کسی کو مجرم ٹھہرا نہیں سکتی۔ نور علی جلا بھنا تھا۔ وہ پولیس کی دلیلوں سے کیسے رام ہوتا۔ اُسنے تو تھانے کو سر پر اُٹھا کے رکھا تھا۔ پورے دن یہ ہنگامہ چلتا رہا۔ نور علی کے ہوہلا مچانے کے باوجود

پولیس ٹس سے مس نہ ہوئی اور اسطرح اُسکی ساری ہنگامہ آرائی اکارت گئی ۔

ایک ہفتے بعد حیدر پہلوان سے بڑی چوک ہوئی۔ وہ وہی صدری پہن کر نکلا جو نور علی نے لکھنو کے ایک مولانا سے خریدی تھی۔ نور علی جو کہ اس واردات سے اسطرح جھلایا بیٹھا تھا کہ اُسے ہر شخص مشکوک اور مشتبہ لگتا تھا۔ اتفاق دیکھئے ادھر وہ گوشت لینے کے لئے جب رفیق قصاب کی دکان پر پہونچا تو وہاں نور علی پہلے سے ہی بیٹھا پولیس کو پانی پی پی کر کوس رہا تھا، حیدر پہلوان نور علی کو دیکھ کر ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو جاتا نور علی کی عقابی نگاہ حیدر پہلوان کی صدری پر پڑ گئی تو وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور حیدر پہلوان کی صدری پر ایسے ٹوٹ پڑا جیسے چیل چوزے پر۔ حیدر پہلوان کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ نور علی نے اپنی صدری پہچان لی ہے۔ جس حیدر پہلوان پر بڑے بڑے ترم خان ہاتھ ڈالنے کی تاب وتواں نہیں رکھتے تھے وہ اس وقت نور علی کی گرفت میں تھا۔ نہ جانے نور علی میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ حیدر پہلوان جیسا شاطر بدمعاش اس وقت نور علی کے چنگل میں ایسے پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے ایک کمزور ہرن شیر کے پنجوں میں تڑپتا ہے۔ نور علی نے حیدر پہلوان کا گریبان اتنی مظبوطی سے پکڑ کے رکھا ہوا تھا کہ حیدر پہلوان پورا زور لگانے کے باوجود اپنے آپ کو نور علی کی گرفت سے آزاد نہیں کرا پا رہا تھا۔ وہ اُس سے بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

''یہ صدری میری ہے۔ یہ تمہارے پاس کیسے پہونچ گئی؟''

وہ اس سوال کا کیا جواب دے پاتا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد میں تھا مگر نور علی نے اُسے اجگر کی طرح جکڑ کے رکھا تھا۔ حیدر پہلوان کتنا بھی شاطر اور قوی ہیکل تھا مگر اسوقت وہ نور علی کی یلغار کے آگے اپنے سارے پنجے چھکے بھول چکا تھا۔ نور علی نے بازار میں ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ بغل میں جو پولیس تھانہ تھا وہاں تک اس ہنگامے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ چند پولیس والے تھانے سے نکل کر رفیق قصائی کی دکان پر دندناتے ہوئے چلے آئے۔ اتنے میں بہت اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ جو لوگ حیدر پہلوان کے آگے چوں نہیں کرتے تھے نور علی کی جوان مردی دیکھ کر وہ بھی شیر ہو گئے اور اُنہوں نے بھی نور علی کی حمایت میں حیدر پہلوان کا گھیراو کر دیا۔ حیدر پہلوان کے فرار کے سبھی راستے مسدود ہو چکے تھے۔ نور

علی نے اُسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے پوچھو یہ صدری اس کے پاس کہاں سے آ گئی۔ یہ میری صدری ہے جو اس کمینے نے پہنی ہے۔ اگر خدا کو حاظر ناظر جان کر تم لوگوں نے تفتیش کی ہوتی تو یہ اب تک آزاد نہ پھرتا۔ مجھے تو پہلے دن سے ہی شک تھا کہ میرے گھر میں سینددھ لگانے والے اور کوئی نہیں بلکہ یہی خبیث ہے۔ خدا غارت کرے اس مردود کو، میری زندگی بھر کی کمائی لوٹ کر لے گیا۔ اب اسے اتنا توڑو، اتنا توڑو کہ اسے نانی یاد آجائے اور یہ میرا سارا مال مجھے لوٹا دے۔''

پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی۔ حیدر پہلوان اپنی بیوقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ ایک صدری نے اُسکا بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ اس بار پولیس نے اُسکا پیلیتھن نکال کر رکھ دیا۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد بھی وہ نہیں ٹوٹا۔ جب نور علی کی بیوی تھانے میں آ کر اُسکے سامنے رونے اور گڑگڑانے لگی تب جا کے اُسکا من پسیجا اور اُسنے نہ صرف اپنا جرم قبول کیا بلکہ مال مسروقہ کی نشاندہی بھی کی۔

اس کیس میں اُسے چھ مہینے کی جیل ہوئی۔ اُسے جیل جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اُسکا ایک پاوں جیل کے اندر اور جیل کے باہر رہتا تھا۔ جیل کو تو وہ اپنا دوسرا گھر سمجھتا تھا اسلئے جب بھی اُسے سزا ہوتی تھی تو وہ خوشی خوشی چلا جاتا تھا۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ نہیں سکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ نوچ کھسوٹ کر جیل کے اہلکار اُس سے لے گئے تھے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ کھانا پینا جیل کا تھا نہیں تو وہ بھوکوں مر گیا ہوتا۔ جیل میں رہ کر وہ آلسی اور کسل مند ہو کے رہ جاتا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد اُسے اپنی تنگی ترشی کا احساس ہونے لگا۔ باپ دادا اپنے پیچھے بھوک مری اور بدحالی کے سوا کچھ چھوڑ کے نہیں گئے تھے اسلئے حیدر پہلوان کو سب سے پہلے اپنی گزران کا بندوبست کرتا تھا۔ وہ کہاں ہاتھ مارے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جیل ہونے کے بعد اُسکا دبدبہ کم ہو گیا تھا اسلئے وہ اپنے گاوں میں سینددھ لگا کر اپنے لئے نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُسے پکڑے جانے کا احتمال تھا اسلئے اُسنے گاوں سے باہر واردات کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ قرب کے ایک گاؤں میں سیندھ لگانے کے ارادے سے پہونچ گیا تو یکا یک موسم کے تیور بدل گئے۔ آسمان پر پہلے سے ہی مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ حیدر پہلوان رات کے اندھیارے میں لنگوٹ پہن کے اُس مکان کے عقب میں کھڑا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا جہاں وہ سیندھ لگانے آیا تھا۔ اس سے پہلے مینہ برسنے لگے اُس نے ایک دیوار میں سیندھ لگانے کے لئے اوزار نکالے۔ اچانک بجلیاں کڑکنے لگیں۔ بادل گرجنے لگے۔ حیدر پہلوان نے اسے اپنے لئے رحمت سمجھ لیا کیونکہ اُسکے اوزار چلانے کی آواز اس شور میں دب کر رہ گئی تھی۔

جب وہ دیوار میں بڑا سا سوراخ بنا کر اندر گھس گیا تو اُسنے گھر کے مکینوں کو گہری نیند میں پایا۔ وہ ایک ایک کر کے ہر چیز کو کھنگالنے لگا۔ کھنگالتے کھنگالتے وہ دوسرے کمرے میں پہونچ گیا جہاں ایک لڑکی گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اماوس کی رات تھی مگر اُس لڑکی کا چہرہ پونم کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ حیدر پہلوان نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو وہ مبہوت ہو کر اُس لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔ لڑکی کیا تھی چندے آفتاب چندے مہتاب۔ بجلیوں کی چکا چوندھ میں اس لڑکی کا چہرہ پوری طرح سے تاباں ہو جاتا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر اپنا عندیہ بھول گیا اور وہ بت بنا اس لڑکی کو یک ٹک دیکھتا رہا۔ اچانک دوسرے کمرے سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ آواز سن کر اُس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ جن قدموں سے آیا تھا ان ہی قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ اُس نے چوری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ لڑکی اُسکے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔ بس اُسی کی چھبی اُسکے دل و دماغ کے اُفق پر دمکتی رہی۔ اُسے پانے کی تڑپ اُسکے دل میں ہلورے لے رہی تھی۔ وہ اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ اتنا بدنام تھا کہ کوئی اپنی لڑکی کا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں دینے کے لئے کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہوتا مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اُن میں سے تھا جو ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں۔ اُسنے سب سے پہلے اُس لڑکی کے بارے میں ساری جانکاری حاصل کی۔ اُسے اس بات سے بڑی آسودگی ملی کہ اُس لڑکی کا باپ ایک نمبر کا حریص اور کوس کوڑی دوڑنے والا آدمی ہے۔ پیسہ اسکے لئے سب کچھ تھا۔ اسی لالچی پن کی وجہ سے اُسکے دو جوان بیٹے شادی کر کے اُس سے الگ ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اُسکی بیٹی کے

علی نے اُسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے پوچھو یہ صدری اس کے پاس کہاں سے آ گئی۔ یہ میری صدری ہے جو اس کمینے نے پہنی ہے۔ اگر خدا کو حاظر ناظر جان کر تم لوگوں نے تفتیش کی ہوتی تو یہ اب تک آزاد نہ پھرتا۔ مجھے تو پہلے دن سے ہی شک تھا کہ میرے گھر میں سینندھ لگانے والے اور کوئی نہیں بلکہ یہی خبیث ہے۔ خدا غارت کرے اس مردود کو، میری زندگی بھر کی کمائی لوٹ کر لے گیا۔ اب اسے اتنا توڑو، اتنا توڑو کہ اسے نانی یاد آ جائے اور یہ میرا سارا مال مجھے لوٹا دے۔''

پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی۔ حیدر پہلوان اپنی بیوقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ ایک صدری نے اُسکا بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ اس بار پولیس نے اُسکا پیلیتھن نکال کر رکھ دیا۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد بھی وہ نہیں ٹوٹا۔ جب نور علی کی بیوی تھانے میں آ کر اُسکے سامنے رونے اور گڑگڑانے لگی تب جا کے اُسکا من پسیجا اور اُسنے نہ صرف اپنا جرم قبول کیا بلکہ مال مسروقہ کی نشاندہی بھی کی۔

اس کیس میں اُسے چھ مہینے کی جیل ہوئی۔ اُسے جیل جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اُسکا ایک پاوں جیل کے اندر اور جیل کے باہر رہتا تھا۔ جیل کو تو وہ اپنا دوسرا گھر سمجھتا تھا اسلیئے جب بھی اُسے سزا ہوتی تھی تو وہ خوشی خوشی چلا جاتا تھا۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ نہیں سکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ نوچ کھسوٹ کر جیل کے اہلکار اُس سے لے گئے تھے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ کھانا پینا جیل کا تھا نہیں تو وہ بھوکوں مر گیا ہوتا۔ جیل میں رہ کر وہ آلسی اور کسل مند ہو کے رہ جاتا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد اُسے اپنی تنگی ترشی کا احساس ہونے لگا۔ باپ دادا اپنے پیچھے بھوک مری اور بدحالی کے سوا کچھ چھوڑ کے نہیں گئے تھے اسلیئے حیدر پہلوان کو سب سے پہلے اپنی گزران کا بندوبست کرتا تھا۔ وہ کہاں ہاتھ مارے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جیل ہونے کے بعد اُسکا دبدبہ کم ہو گیا تھا اسلیئے وہ اپنے گاوں میں سینندھ لگا کر اپنے لیئے نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُسے پکڑے جانے کا احتمال تھا اسلیئے اُسنے گاوں سے باہر واردات کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ قرب کے ایک گاوں میں سیندھ لگانے کے ارادے سے پہونچ گیا تو یکا یک موسم کے تیور بدل گئے۔ آسمان پر پہلے سے ہی مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ حیدر پہلوان رات کے اندھیارے میں لنگوٹ پہن کے اُس مکان کے عقب میں کھڑا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا جہاں وہ سیندھ لگانے آیا تھا۔ اس سے پہلے مینہ برسنے لگے اُس نے ایک دیوار میں سیندھ لگانے کے لئے اوزار نکالے۔ اچانک بجلیاں کڑکنے لگیں۔ بادل گرجنے لگے۔ حیدر پہلوان نے اسے اپنے لئے رحمت سمجھ لیا کیونکہ اُسکے اوزار چلانے کی آواز اس شور میں دب کر رہ گئی تھی۔ جب وہ دیوار میں بڑا سا سوراخ بنا کر اندر گھس گیا تو اُسنے گھر کے مکینوں کو گہری نیند میں پایا۔ وہ ایک ایک کر کے ہر چیز کو کھنگالنے لگا۔ کھنگالتے کھنگالتے وہ دوسرے کمرے میں پہونچ گیا جہاں ایک لڑکی گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اماوس کی رات تھی مگر اُس لڑکی کا چہرہ پونم کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ حیدر پہلوان نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو وہ مبہوت ہو کر اُس لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔ لڑکی کیا تھی چندے آفتاب چندے مہتاب۔ بجلیوں کی چکا چوندھ میں اس لڑکی کا چہرہ پوری طرح سے تاباں ہو جاتا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر اپنا عندیہ بھول گیا اور وہ بت بنا اس لڑکی کو یک ٹک دیکھتا رہا۔ اچانک دوسرے کمرے سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ آواز سن کر اُس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ جن قدموں سے آیا تھا ان ہی قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ اُس نے چوری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ لڑکی اُسکے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔ بس اُسی کی چھبی اُسکے دل و دماغ کے اُفق پر دمکتی رہی۔ اُسے پانے کی تڑپ اُسکے دل میں ہلورے لے رہی تھی۔ وہ اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ اتنا بدنام تھا کہ کوئی اپنی لڑکی کا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں دینے کے لئے کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہوتا مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اُن میں سے تھا جو ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں۔ اُسنے سب سے پہلے اُس لڑکی کے بارے میں ساری جانکاری حاصل کی۔ اُسے اس بات سے بڑی آسودگی ملی کہ اُس لڑکی کا باپ ایک نمبر کا حریص اور کوس کوڑی دوڑنے والا آدمی ہے۔ پیسہ اسکے لئے سب کچھ تھا۔ اسی لالچی پن کی وجہ سے اُسکے دو جوان بیٹے شادی کر کے اُس سے الگ ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اُسکی بیٹی کے

ہاتھ پیلے نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ گانٹھ ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جمال شیخ اسی گاؤں میں رہتا تھا جو رشتے جوڑنے کا کام کرتا تھا۔ اُسنے اس کام میں اپنی اچھی خاصی ساکھ بنا کے رکھی تھی۔ اُسکے لائے گئے رشتے پر لوگ آنکھ بند کر کے مہر لگا دیتے تھے۔ حیدر پہلوان کو بھی جمال شیخ کی یاد آ گئی۔ پو پھٹتے ہی وہ گھر سے نکلا اور سیدھے جمال کے گھر پہونچ گیا۔ اتنی صبح حیدر کو اپنے گھر میں دیکھ کر جمال کا ماتھا ٹھنکا۔ پھسپھسی آواز میں پوچھا۔

''خدا خیر کرے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا بھائی؟''

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے. جمال بھائی''

''تو پھر تم کس خوشی میں اتنے سویرے میرے گھر پر دستک دینے چلے آئے؟''

''جمال بھائی تم سے ایک ضروری کام ہے۔ وہ کہتے ہیں نا اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ میں بھی اپنی اس چھٹکل زندگی سے عاجز آ چکا ہوں۔ تم اتنے سارے کنواروں کو ٹھکانے لگا چکے ہو۔ مجھے بھی کہیں اُلجھا دو تا کہ میں سلجھ جاوں۔ اب اس سیاہ کار زندگی سے دل بھر گیا ہے میرا۔ میں اس دلدل سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ خدارا میری مدد کرو۔ اللہ تمہیں اس نیک کام کا اجر ضرور دے گا۔ میرا رشتہ کرا دو۔ جو بھی اُجرت مانگو گے بخدا میں خوشی خوشی دے دوں گا۔ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔''

جمال نے ایک شماتت آمیز قہقہ لگا کر کہا۔

''بھائی پہلے مجھے یہ بتاو کہ بلی کے گلے گھنٹی کون باندھے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''بھائی اس گاوں میں کسی سے تمہارا کردار چھپا نہیں ہے۔ آدمی غلطی سے مکھی نگلے تو نگلے، آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا۔ میں جہاں تمہارے رشتے کی بات کروں گا وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔''

''اس گاوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں کوئی اپنی لڑکی کو مجھ سے نہیں بیاہے گا۔ میں یہاں کی نہیں پاس کے گاوں کی بات کر رہا ہوں۔ ایک لڑکی دیکھی ہے میں نے۔ تم اگر اُس سے

میرا نکاح کرادو گے تو میں ساری زندگی تمہارے اس احسان کو نہیں بھولوں گا۔" وہ اُسکے پاوں پکڑ کر رو پڑا۔ جمال نے اپنے پاوں چھڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میں یقین تو نہیں دلا سکتا البتہ میں کوشش ضرور کروں گا۔ باقی سب اللہ کے ہاتھ میں۔ تمہارے نصیب میں ٹھکانے لگنا ہو تو بیل منڈھے چڑھے گی نہیں تو"

"تم کوشش کر کے تو دیکھو۔ راز کی بات سن لو۔ اُس لڑکی کے بارے میں میں نے جو پتا لگایا وہ یہ ہے کہ اُس کا باپ بڑا لالچی ہے۔ لڑکی کیا پیسہ دکھا کر تم اُس سے اُسکا ایمان بھی خرید سکتے ہو۔ اتنا بھوکا ہے وہ دولت کا"

جمال نے حیدر پہلوان کی بات غور سے سنی اور پھر اُس سے ایک ہفتے بعد ملنے کا وعدہ کر کے اُسے گھر سے چلتا کر دیا۔

حیدر پہلوان نے اس ایک ہفتے کے درمیان کئی جگہ ہاتھ مارا۔ ایک گھر میں اُسنے دو لاکھ کے زیور اُڑا لئے۔ ایک گھر سے نقدی چرالی۔ اسی بیچ وہ جمال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ جمال بھی خاصے کی چیز تھا۔ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانے میں ماہر تھا۔ اُسنے لڑکی کے باپ سے ملاقات کی اور حیدر پہلوان کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملانے لگا۔ ساتھ ہی اُسے یہ لالچ بھی دیا کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ حیدر پہلوان کے ہاتھ میں دینے کے عوض جتنی بھی رقم کی مانگ کرے گی اُتنی رقم اُسے دے دی جائے گی۔ لڑکی کے باپ کمال خان کو لگا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اُسنے ایک لاکھ کی مانگ کی۔ اگلے روز حیدر سے ایک لاکھ کا سونا لے کر وہ کمال خان کے گھر پہونچ گیا۔ کمال خان کا دل یہ سوچ کر باغ باغ ہوا کہ لڑکی کچھ لے کے نہیں جارہی ہے بلکہ کچھ دے کے ہی جارہی ہے۔ اُسنے رشتے پر اقرار کی مہر لگادی۔

ہفتے عشرے کے بعد حیدر کی بیل منڈھے چڑھ گئی۔ وہ اپنی بدمعاش ٹولی کے ساتھ دلہا بن کر روانہ ہوا۔ اس شادی میں اُسنے انتہائی احتیاط اور راز داری برتی۔ وہ جانتا تھا کہ اُسکے ایک نہیں سینکڑوں دشمن ہیں جو اُسے آباد ہوتے دیکھا نہیں چاہیں گے اسلئے وہ اندھیرا ہوتے ہی اپنی ٹولی کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا اور راستے میں اُسنے دلہا کے کپڑے اور قراقلی پہن لی۔ اُسکے بعد وہ دلہن کے گھر پہونچا جہاں قاضی پہلے

سے منتظر تھا۔ ان دونوں کا نکاح پڑھا گیا اور طعام سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ دلہن کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔

حیدر پہلوان نے کلھیا میں گڑ پھوڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ کلھیا میں گڑ تھوڑے ہی پھوٹتا ہے۔ یہ خبر جب گاؤں میں پھیل گئی کہ حیدر پہلوان نے بیاہ رچالیا ہے تو نور علی جو پہلے سے ہی اسکی بربادی کے درپے تھا کو یہ جاننے کی کرید لگی کہ آخر ایسا کون سا بے رحم باپ ہے جس نے اپنی بیٹی کو اس دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ اُسنے کھوج خبر کر کے لڑکی کے باپ کا پتا نکالا اور اگلے روز وہ اُس سے ملنے پہونچ گیا جب اُسنے حیدر پہلوانوں کے سیاہ کرتوتوں سے آگاہ کر دیا تو وہ چکرا کے رہ گیا۔ اُس کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا۔ وہ جمال کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ وہ اُسی وقت جمال کے گھر پہونچا۔ جمال نہیں ملا تو وہ اپنی بیٹی کے سسرال پہونچ گیا وہ پہلے دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پھر وہ جمال اور حیدر کو صلواتیں سنانے لگا۔

''بیٹا ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔ یہ ایک نمبر کا بدچلن اور بدکار آدمی ہے۔ میں اتنا بے غیرت نہیں کہ تمہیں اس دلدل میں پھینک کے تماشہ دیکھوں۔ میں تمہیں ایک پل بھی ایسے غلیظ آدمی کے ساتھ رہنے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں خلع دلا دوں گا۔ بھلا ہو نور علی کا جس نے مجھے آئینہ دکھا دیا۔ قسم خدا کی اس آدمی کا گلا گھونٹنے کا دل کرتا ہے۔ اس پر خدا کی مار۔ کیسے حرام کی کمائی سے مجھے اندھا کر دیا۔ اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ اس سے پہلے کہ برادری میں ہماری تھو تھو ہو جائے ابھی چلو میرے ساتھ'' کہہ کر اُسنے اُسکی بانہہ پکڑلی اور اُسے گھر سے لے گیا۔ حیدر پہلوان منجمد ہو کر دروازے کے پیچھے کھڑے کا کھڑا ہی رہ گیا۔ وہ اپنی لٹتی ہوئی دنیا کو روک بھی نہ سکا۔ اُس کے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اُسکی زندگی میں جو ضیا پھیلی تھی، نور علی نے وہ ضیا اُس سے چھین لی تھی اور اُسے اندھیرے میں پھر سے غرق کر دیا تھا۔ اُسکا خون کھول اُٹھا۔ وہ نور علی کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتا تھا۔ اُسے تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔ وہ بدلے کی آگ میں جھلستا رہا۔ رات و دن وہ درد کے انگاروں پر لوٹتا رہتا تھا۔ نور علی نے اُسکی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا تھا۔

ایک دن نور علی اپنے پریوار کے ساتھ اپنے ایک رشتہ دار کی شادی میں شریک ہونے کے لئے چلا گیا۔ گھر خالی پڑا تھا۔ حیدر پہلوان پہلے سے ہی تاک میں بیٹھا تھا۔ اُسنے اُسی رات گھر میں آگ لگا

دی۔ گھر جل کر خاکستر ہو گیا۔ گھر جلتے دیکھ کر اُسکے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اگلے روز جب نور علی گھر لوٹا تو اپنے راکھ ہوئے گھر کو دیکھ کر وہ غش کھا کے گرا۔ اُسکے بیوی بچوں نے کہرام مچایا۔ نور علی جب ہوش میں آیا تو وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کارستانی کس کی ہے۔ اُس نے پولیس تھانے میں جا کر حیدر پہلوان کے خلاف پرچہ کٹوایا۔ حیدر پہلوان کو پکڑ کر تھانے لایا گیا۔ پہلے پوچھ تاچھ ہوئی۔ پھر مار پیٹ۔ حیدر پہلوان مار کھاتا رہا اور بار بار اپنی بے گناہی کی دہائی دیتا رہا۔ سبھی طریقے آزمانے کے باوجود پولیس اُسے ملزم ثابت نہ کر سکی اسلئے اُسے چھوڑ دیا گیا۔

نور علی کو حیدر پہلوان کے چھوٹ جانے سے بڑا گہرا دھچکا لگا پر اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اس بار حیدر پہلوان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ اُسے آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن حیدر پہلوان کے گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ گھر سے کئی چرائی ہوئی چیزیں برامد ہوئیں۔ حیدر پہلوان اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر پہونچ جاتا، پولیس نے اُسے باہر سے ہی گرفتار کر لیا۔ حیدر پہلوان ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اُسے کس جرم میں گرفتار کیا گیا۔ یہ عقدہ بہت جلد کھلا۔ اُس پر راحت علی کے گھر میں چوری کرنے کا الزام تھا۔ راحت علی نور علی کا بھانجا تھا۔ اُسی نے حیدر پہلوان پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ اسکی تصدیق اُس کے گھر سے مال مسروقہ برامد ہونے کے ساتھ ہوئی تھی۔ حیدر پہلوان ٹھسے سے نیچے بیٹھ گیا۔ پہلی بار اُسے اُس جرم میں گرفتار کیا گیا تھا جو اُس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس بار بدنصیبی نے اُسکی زندگی میں اتنی گہری سیندھ لگائی تھی کہ اس کی کسک اُسکے دل کو چیرتے ہوئے اُسکی روح تک اُتر گئی تھی۔

# محبوب کی آزادی

بیس سال گزر گئے محبوب علی کی زندگی میں رتی بھر بدلاؤ نہیں آیا۔ اُسکے نصیب میں چاکری کرنا لکھا تھا۔ پہلے وہ اللہ بخش کے ڈنگر پالتا تھا۔ مویشی خانے سے گوبر اور آخور نکالتا تھا۔ بھینسوں کو نہلاتا، دھلاتا تھا۔ پھر اُنہیں جنگل چرنے کے لئے لے جاتا تھا۔ دوپہر کو جب وہ جنگل سے لوٹتا تھا تو اللہ بخش کی بیوی منہ پھاڑے کچن کے باہر تلچھو ملچھو کرتی دکھائی دیتی تھی۔ محبوب ابھی اندر آ کر دم بھی لے نہیں پاتا تھا کہ اللہ بخش کی بیوی گلنار سارے جھوٹے برتن اُسکے سامنے لاکر پٹخ دیتی تھی۔ وہ اپنی بھوک کو مار کر یہ جھوٹے برتن لے کے گھر کے سامنے بہتے نالے کے پاس انہیں دھو کر لے آتا تھا۔ اسکے نصیب میں دو گھڑی کا آرام نہیں لکھا تھا۔ آبے لونڈے جابے لونڈے کے مصداق وہ اُسے دوڑاتے رہتے تھے۔ کبھی جنگل، کبھی کچن تو کبھی مویشی خانہ۔ رات کو بھی اللہ بخش اُس سے کام کرواتا تھا۔ اُسے پاوں دابے بنا نیند نہیں آتی تھی۔ محبوب علی آدھی رات تک اُسکے پاوں دباتا تھا۔ کبھی اُسے جھپکی آجاتی تھی تو اللہ بخش اُسے لات مار کر جگا دیتا تھا۔ کھانا بھی اُسے پیٹ بھر کے نہیں ملتا تھا۔ دو مکئی کی روٹی اور ایک پیاز۔ وہ اسی پیاز کے ٹکڑے کر کے ان ٹکڑوں کو روٹی میں لپیٹ کر کھاتا تھا۔ یہ اُسکا روز کا کھانا ہوتا تھا۔ سونے کے لئے مویشیوں کا بندی خانہ تھا

جہاں اُسنے اپنی جائیداد سنبھال کے رکھی تھی۔ایک پترے کا زنگ آلودہ ٹرنک اور ایک میلی کچیلی رضائی۔کبھی وہ فرش پر گھاس بچھاتا تھا، ٹرنک کو سرہانہ بنالیتا تھا اور اوپر اپنی میلی کچیلی رضائی اوڑھ لیتا تھا جسمیں ہمواری زرا بھر بھی نہیں تھی۔اس ناہمواری کی وجہ اون کا پھسلنا تھا جو کہیں رسولی کی طرح ایک جگہ جمع ہوگئی تھی اور کہیں پر رضائی کے پھوسرے نکل آئے تھے۔وہ اس رضائی کو متاع عزیز کی طرح اپنے سینے سے لگائے رہتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ اُس کے ماں باپ کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔اس رضائی میں اُنکے بدن کی مہک آج بھی رچی بسی تھی۔وہ کبھی اس رضائی کو توشک کی طرح استعمال کرتا تھا تو کبھی ردا کی طرح اوڑھ لیتا تھا۔وہ جب کبھی بیحد اُداس ہوجاتا تھا تو وہ اس رضائی سے باتیں کرنے لگتا تھا۔کبھی روتا تو کبھی اسی رضائی میں منہ چھپا کر سکنے لگتا تھا۔اُسے لگتا تھا جیسے یہ لحاف نہیں اُسکی ماں ہے جو اُسے اپنے پہلو میں چھپا لیتی ہے۔مزے کی بات یہ تھی کہ اُسکا دکھ و درد سمجھنے والا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ وہ بے زبان بھینسیں تھیں جنہیں وہ دن میں گھاس چرانے کے لئے جنگل میں لے کے جاتا تھا۔وہ حیوان مطلق سہی مگر حیوان ناطق کی طرح احسان فراموش نہیں تھیں۔وہ جس طرح اُنکی دیکھ بھال کرتا تھا اس بات کا احساس تھا انہیں جبھی تو وہ رات کو اُسکے سر کو چاٹ چاٹ کر اُسے سلادیتی تھیں۔

آڑو چھوڑ کے پہلگام آیا تو یہاں بھی اُسکی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔پہلے وہ گوبر اُٹھاتا تھا۔مویشی خانہ دھوتا تھا، اب وہ بچوں کے لنگوٹ دھوتا تھا، اُن کا بول براز صاف کرتا تھا۔صبح و شام سارے جھوٹے برتن صاف کرتا تھا۔رات کو سیف اللہ چودھری کے پاوں دباتا تھا۔جب اُسے نیند آجاتی تھی تب جاکے اُسے دونوالے کھانے کے لئے مل جاتے تھے۔کھانے میں تھوڑا سا چاول اور سبزی ہوتی تھی۔برسوں ہوئے جب اُسنے گوشت کا مزہ چکھا تھا۔یہ لوگ روز گوشت پکاتے تھے مگر اُسے کھانے کو نہیں دیتے تھے۔اُسکے نصیب میں یا تو اُبالا اُسبالا یا باسی بتاسی کھانا ہوتا تھا۔وہ زہر مار کے کھالیتا تھا۔کیا کرتا وہ؟ نہ کھاتا تو بھوک کے مارے مرجاتا، اسلئے طوعاً و کراہاً وہ یہ باسی بے مزہ کھانا کھالیتا تھا۔یہ انسانی فطرت ہے کہ جب بھی وہ تکلیف میں ہوتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنی ماں یاد آتی ہے بعد میں خدا۔اُسے بھی ہر رات اپنی ماں یاد آتی تھی اور ماں کی یاد اُسے لہولہو رلادیتی تھی۔اُسے اُسکا وہ نورانی چہرہ یاد آتا تھا جس پر خدا نے جیسے

اپنا ہاتھ پھیر دیا تھا۔ اُسے یاد آتا تھا کہ جب وہ اُسے کھانا کھلاتی تھی تو تب تک اُسکے سامنے چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی تھی جب تک وہ شکم سیر نہیں ہو جاتا تھا۔ اس بیچ وہ ممتا بھری آنکھوں سے اُسے تب تک نہارتی رہتی تھی، اُس پر صدقے واری ہوتی تھی جب تک وہ ٹانگیں پھیلا کر سو نہیں جاتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ جو میلی کچیلی رضائی لے کے آیا تھا وہی اسکا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کبھی پچھواڑے میں ایک ٹاٹ کی بوری بچھا کر اور ٹرنک کو اپنا سرہانہ سمجھ کر وہ اس رضائی کو اپنے اوپر لے کے سوتا تھا۔ کبھی اگر اُسے بھوک لگتی تھی تو وہ گھر کی مالکن سے کھانا نہیں مانگ سکتا تھا کیونکہ وہ تو اپنے شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ کہتے ہیں نا اللہ ملائی کیسی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑی۔ سیف اللہ جتنا موذی اور خسیس آدمی تھا اُسکی بیوی اُس سے بھی زیادہ بخیل اور بے درد تھی۔ وہ جتنے کا کھانا اُسے کھلاتی تھی بدلے میں اُس سے حبہ حبہ وصول کرتی تھی۔ وہ دوپہر میں جب کھانا کھا کے سونے چلی جاتی تھی تو باورچی خانے میں تالا لگا کر جاتی تھی۔ وہ کھرچن سے اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی اگر وہ مالکن کی نظروں سے چھپ چھپا کر رسوئی میں کوئی بڑی چیز اُٹھا لیتا اور وہ پکڑا جاتا تو پھر اُسکی خیر نہیں ہوتی تھی۔ سیف اللہ کی بیوی زلیخا مار مارے اُسکے گال بجھا دیتی تھی۔ کمبخت کے گال بھی اتنے گورے تھے کہ دو طمانچے پڑتے ہی اُسکے گال شفق زار بن جاتے تھے۔ زلیخا کا یہ ماننا تھا کہ نوکر کو مرغوب غذائیں کھانے کو نہ دو۔ جب بھی دو اُبالا اسبالا دو۔ کھانے میں اتنی ہی غذا دو جس سے وہ زندہ رہ سکے۔ پیٹ بھر کے دو گے تو وہ کھا پی کے موٹا فربہ ہو جائیگا اور پھر آلسی اور کام چور بن جائے گا۔

اپنی ہی ذات برادری کے لوگوں کے رویے سے اُسکے اندا اتنی کڑواہٹ بھر گئی تھی کہ اُسے کسی سے کوئی لگاؤ نہ رہا تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اُسے سیف اللہ سے تھا اور نہ ہی چودھری اللہ بخش سے۔ وہ تو بس زندگی کے دن جیسے تیسے کاٹ رہا تھا۔ چھٹ پنے میں ہی اُسکا بچپن چھن گیا تھا۔ بے رحم حالات نے اُس سے اُسکی خوشیاں چھین لی تھیں۔ ماں باپ کا پیار چھین لیا تھا۔ کبھی کبھی اُسے اس بات پر بھی غصہ آرہا تھا کہ جب وہ ہر روز اپنے ماں باپ کے ساتھ جنگل جاتا تھا۔ اُس دن وہ کیوں نہیں گیا۔ کیا یہ مشیت ایزدی تھی؟ یہ سوال اُسے رہ رہ کے پریشان کرتا تھا۔

محبوب علی کا نام بے شک محبوب تھا پر وہ کسی کا مونس اور محبوب نہیں تھا۔ آڑو کی حسین وادیوں میں اُسنے بے شک جنم لیا تھا۔ وہ بیحد خوبصورت تھا مگر ایسی خوبصورتی کا کیا فیض؟ کہتے ہیں کہ بے فیض اگر یوسف ثانی ہے تو کیا ہے؟ وہ بھی تہہ دست تھا، غریب تھا، نادار تھا اسلئے ہر کوئی اُسے جوتے کی نوک پر مارتا تھا۔ اُسکی زندگی میں ویرانی اور آشفتہ حالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ برسوں پہلے یتیم ہو چکا تھا۔ اُسے یتیم و یسیسر بنانے میں کسی انسان کا نہیں بلکہ قدرت کا ہاتھ تھا۔ اُسکے ماں باپ جو کہ پیشے سے بکروال تھے۔ آڑو کی ایک پہاڑی پر رہتے تھے۔ یہ اُٹھاؤ چولھے ایک جگہ ٹک کے نہیں رہتے ہیں۔ جنگل جنگل گھومتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان کے پاس اب پہلے جیسا گلہ بھی نہیں رہا تھا جسے لے کر وہ شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف کوچ کرتے۔، اوپر سے محبوب چھوٹا بھی تھا اس لئے ایک ٹھور سے دوسرے ٹھور بھٹکنے کی بجائے اُنہوں نے آڑو میں ہی ایک ڈھوکا بنالیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہ کر بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ جنگل اُسکا ساتھی اور نگہبان تھا۔ وہ جس ڈال پر چاہتا، چڑھ کے بیٹھ جاتا تھا۔ جو پھل بھائے وہ کھالیتا تھا۔ کبھی اپنی غلیل سے ہدہد یا جنگلی مرغے کا شکار کرتا تھا۔ ماں اپنے بیٹے کو قلقاریاں مارتے دیکھتی تو اُس پر واری صدقے ہوتی تھی۔ کتنی پرسکون اور خوشحال تھی اُنکی زندگی۔ وہ غریب ہوتے ہوئے بھی تنگ دل نہ تھے۔ اُنکی زندگی میں کتنی یکسوئی، شادابی اور فارغ البالی تھی۔ اُنکا کل اثاثہ دس بیس بھیڑ بکریوں کا جھنڈ تھا جس کو پال کر وہ اپنا گزارہ چلاتے تھے۔ ان بھیڑ بکریوں کی بدولت اُنکی زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی اُسکا باپ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر پہلگام میں بیچ کے آتا تھا۔ جن سے چار پیسے کی فاضل کمائی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ چار پیسے وہ اپنے بچے کی خوشیوں پر قربان کر دیتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ موسم اچانک بدل گیا۔ پہلے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ اُسکے بعد آسمان میں بادل گرجنے لگے،، بجلیاں کڑکنے لگیں۔ اُسکے ماں باپ جنگل میں اپنے گلے کے ساتھ تھے جب کہ وہ گھر میں اکیلا تھا اور اپنے ماں باپ کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ لوٹ کر نہیں آئے۔ ہونی اپنا کام کر گئی۔ آسمان سے ایک کڑکڑاتی ہوئی بجلی گری جس نے ان دونوں کو اپنی ذد میں لیا اور دونوں وہیں پر جل کر راکھ ہو گئے۔ اُس وقت محبوب کی عمر محض سولہ سال تھی۔

محبوب کا سب کچھ چلا گیا تھا۔ ماں باپ بھیڑ بکریاں۔ وہ کنگال ہو کے رہ گیا تھا۔ اُسکے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو روز پانی پینے کے لئے کنواں کھودتے ہیں۔ جب سرمایہ حیات ہی چلا گیا تھا تو وہ کیسے جی پاتا۔ اللہ بخش نے لونڈے پر ترس کھا کر اُسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہ اپنے آپ کو اللہ بخش کا زیر بار سمجھ رہا تھا جس نے اس مصیبت کی گھڑی میں اُسے آسرا دیا تھا۔ اللہ بخش آڑو کا ایک صاحب حثیت آدمی تھا۔ اُسکے پاس ہر قسم کے ڈھور ڈنگر تھے۔ وہ ہر سال بقر عید سے قبل اپنے ہٹے کٹے دنبے پہلگام بھیج دیتا تھا جنہیں بیچ کر وہ اپنی جھولیاں بھر لیتا تھا۔ اللہ بخش کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ زمین جائیداسب کچھ تھا اُس کے پاس پھر بھی اُسکی بھوک نہیں مٹ رہی تھی۔ اُسکے گھر میں ایک نہیں چار چار نوکر تھے۔ وہ نوکروں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ ایک ایک بوٹی اور روٹی کا وہ حساب رکھتا تھا۔ چار دن کے بعد جب اُسنے محبوب کو اپنا اصلی رنگ دکھایا تو محبوب کا دل صد چاک ہوا۔ اُسنے اُس پر کوئی مہربانی نہیں کی تھی بلکہ وہ اُسے مجبور اور لاچار سمجھ کر اُس کا استحصال کرنا چاہتا تھا۔ اُسنے اُسے کام پر لگا دیا۔ کام تھا کہ شیطان کی آنت جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ محبوب نے دل میں کیا کیا خواب پال رکھے تھے۔ اللہ بخش نے ایک جھٹکے میں اُسکے سارے خواب چکنا چور کر کے رکھ دئے تھے اور ان کی کرچیں اُسکے دل وجگر میں پیوست ہو کر رہ گئیں تھیں۔

ایک دن سیف اللہ بھیڑیں خریدنے آڑو چلا آیا تو اُس نے اس لونڈے کو دیکھا۔ خاموش، آزردہ اور لاچار، پر اپنے کام میں مگن۔ اُسنے اُسے ایک بہتر زندگی کا خواب دکھا کر للچایا۔ وہ اُسکی باتوں کے جھانسے میں آگیا اور اُسنے اللہ بخش کو خیر باد کہہ کے سیف اللہ کی چاکری قبول کی۔ سیف اللہ کا پہلگام میں ایک ہوٹل تھا جس کا نام "چودھری مسلم ہوٹل"، تھا جسمیں کمرے بھی تھے اور کھانے پینے کا ایک ریستوراں بھی تھا۔ یہ ہوٹل ٹورسٹ سیزن میں خوب چلتا تھا۔ اُسکے ہوٹل میں آٹھ دس لوگ کام کرتے تھے۔ سب مقامی لوگ تھے۔ محبوب کو لگا کہ بہت جلد اُسکی مصیبتوں کا انت ہونے والا ہے۔ سیف اللہ اُسے اپنے ہوٹل میں کام پر لگا دے گا۔ ہوٹل میں کام کر کے نہ صرف پیٹ بھر کے کھانا ملے گا بلکہ تھوڑی بہت بخشش بھی مل جایا کرے گی جس سے اُسکا دلدر دور ہو جائے گا اور وہ پائی پائی جوڑ کر بھیڑیں خرید لے گا

اور پھر اپنے ڈھوکے میں جا کر رہے گا مگر یہ سب اُسکی خام خیالی ثابت ہوئی۔ سیف اللہ کے گھر میں دو پوتوں نے ایک ساتھ جنم لیا تھا۔ اُنکے لئے اُسے ایک نوکرانی کی ضرورت تھی جو تلاش بسیار کے باوجود مل نہیں پائی۔ تبھی سیف اللہ کی نظر محبوب پر پڑی، اُسنے سوچا کہ یہ لونڈا دائی سے بہتر کام کرے گا۔ یہی سوچ کر اُسنے محبوب کو کام پر لگا دیا۔ محبوب کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اُسے لگا کہ وہ چولھے سے نکلا تو کڑائی میں جا گرا۔

سیف اللہ کا بہت بڑا کنبہ تھا۔ اتنے بڑے پریوار کو ایک ہی چھت کے نیچے یک جٹ رکھنا کار دارد سے کچھ کم نہ تھا۔ اُسکی دو بیویاں، بارہ بچے، چار بہوئیں اور تین پوتے پوتیاں تھیں۔ پہلے وہ اتنا سخت نہ تھا لیکن جس دن سے اُسکی چھوٹی بیگم اُسی کے ہوٹل میں کام کرنے والے رسوئیا کے ساتھ بھاگ گئی تھی تب سے وہ بہت سخت اور سفاک ہو گیا تھا۔ اُسنے چھوٹی بیگم کو روکنے کی جی توڑ کوشش کی تھی مگر بھاگن کو ہوئے لگائی، پھوڑے کوٹ پھاندے کھائی۔ اب جب کہ اُسکی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی، وہ پھر بھی اپنے آپ کو بوڑھا ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنی جوانی کے بھرم کو قائم رکھنے کے لئے وہ اپنی داڑھی میں مہندی لگاتا تھا۔ پہلے ہفتے اُسکا چہرہ اودے رنگ کے بینگن کی طرح ہو جاتا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اُسکے چہرے پر روغن جوش کی پلیٹ ماردی ہو۔ وہ دن بھر یا تو اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا یا اپنی داڑھی کھجلاتا رہتا تھا جو کھینچ کھینچ کے اُسکے سینے تک لٹک گئی تھی۔ وہ دن میں کبھی سوتا نہیں تھا۔ بس ہر دم اپنی عقابی نگاہئیں ادھر اُدھر گھماتا رہتا تھا کہ کہیں کوئی نوکر کچھ کھا تو نہیں رہا ہے۔

ایک بیگم کے بھاگ جانے سے وہ کافی چڑ چڑا اور واہی ہو گیا تھا۔ سیف اللہ کی دوہری شخصیت تھی۔ باہر شیر اور گھر میں بلی۔ جب کبھی بچوں کے ساتھ اُسکی کسی بات پہ لے دے ہوتی تھی اور زلیخا آنکھیں چوڑی کر دیتی تھیں تو وہ فوراً چیں بول دیتا تھا۔ گھر میں اُسکی دھاک اور دہشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ دن تو کب کے لد چکے تھے جب وہ گھر والوں پر دھونس جماتا تھا کیونکہ تب وہ جوان اور تنومند تھا۔ آج وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جب زلیخا اُسے سب کے سامنے لتے لیتی تھی تو اُسکے سامنے تو وہ بھیگی بلی بن جاتا تھا اور نیچے جا کر وہ اپنی جھونجل اُتار دیتا تھا۔ کوئی ایسا دن نہیں ہوتا تھا جب وہ کسی نہ کسی نوکر کی پٹائی کر دیتا تھا

یعنی کمہار پر بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھ لئے۔ اُسکے نوکر جب بھی اکیلے میں بیٹھتے تھے تو پانی پی پی کر اُسے کوستے رہتے تھے۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ بتیس دانت کی باکا کا بھی اُس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

محبوب کو لے کر بھی زلیخا اور سیف اللہ کے بیچ خوب جھک جھک ہوئی۔ بچے بھی ماں کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ زلیخا بولی۔

''ایک بار تو تم اپنے ہاتھ جلا کے بیٹھو ہو، پھر آگ لے کر اس گھر میں آ گئے۔ یہ مت بھولو کہ تمہارے گھر میں چار چار جوان جہاں بیٹیاں ابھی بھی ہاتھ پسارے کھڑی ہیں۔ اس چکنے لونڈے کو دیکھ کر اگر کسی کا دل پھسل گیا تو کیا کرو گے تم؟''

''تم کس مرض کی دوا ہو۔ تم اس پر نظر رکھا کرو نا''

''میں کیا چوکیدار بن کر اسکے پیچھے سارے دن کھڑی رہوں۔ سٹھیا گئے ہو تم''

''میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ کس کے دل میں کیا ہے میں چہرہ دیکھ کے ہی بھانپ لیتا ہوں۔''

''بس بس رہنے دو اپنی یہ لن ترانی۔ اتنے ہی زیرک تھے تو پھر میری سوت کو بھاگنے کیوں دیا؟ میں کہتی ہوں کہ اس لڑکے کو نیچے کام پر رکھ دو۔ میں اس آگ کو پھوس سے دور ہی رکھنا چاہتی ہوں۔''

زلیخا کی مرضی کے آگے سیف اللہ گھٹنے ٹیک ہی دیتا کہ بڑی بہو نے بیچ میں مداخلت کی۔ وہ اپنے نوزائیدہ بچوں سے پریشان تھی اور اُسے دن بھر انہی کو سنبھالنا پڑتا تھا اسلئے اُسے نوکر کی ضرورت تھی سو وہ محبوب کی حمایت میں کھڑی ہو گئی۔ محبوب کو کام پر رکھ دیا گیا۔ جس کے لئے گھر میں اتنا وبال کھڑا ہو گیا تھا وہ اس گھر میں اپنے آپ کو قفس میں قید پنچھی کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس پنجرے کو توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا، پر وہ جائے کہاں۔ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ اُسکی دنیا کا جغرافیہ بڑا محدود تھا۔ وہ اللہ بخش کے گھر سے شروع ہو کر سیف اللہ کے گھر پر آ کے ختم ہو جاتا تھا۔ اُسکے آگے نہ اُسکی کوئی دنیا تھی، نہ کوئی منزل۔ وہ یہاں سے جائے تو کہاں جائے، یہ سوال اُسے رہ رہ کے بے چین اور بیاکل کر دیتا تھا۔ ایک دن جب وہ

پتیلے کی کھرچن سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہا تھا تو اُسے لگا جیسے کہیں سے دو آنکھیں اُسکا تعاقب کر رہی ہیں۔ اُسکے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُسے لگا کہ ابھی زلیخا آئے گی اور اُسے پیٹے گی۔ اُسکے دل میں ہول اُٹھنے لگا۔ وہ من ہی من میں اپنے مولا کو یاد کرنے لگا۔ وہ ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کھڑکی میں سے دو ہاتھ نکلے اور ان ہاتھوں کی مخروطی اُنگلیوں میں ایک چینی پلیٹ تھی جسمیں تھوڑے سے چاول اور گوشت کی ایک دو بوٹیاں تھیں۔ وہ اپنے اس محسن کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جو اُسکا ان داتا بن کر آیا تھا، تبھی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور اُسمیں سے سیف اللہ کی چھوٹی بیٹی غزالہ نے اُسے اپنی جھلک دکھائی۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسنے لرزتے ہاتھوں سے وہ پلیٹ لیا اور پھر ایک ملگجے کونے میں چھپ کر وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اُسے لگا کہ پروردگار کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وہ ہر زرے تک رزق پہونچاتا ہے۔

اس واقعے کے بعد محبوب علی کا ارادہ بدل گیا۔ اُسے اپنی زندگی سے پیار ہونے لگا۔ ایک ایسا نیک سیرت انسان اُسکی بھوک کو سمجھ گیا تھا۔ اب اُسے کیا پرواہ تھی۔ جب بھی اُسے بھوک ستائے گی وہ لڑکی اُسے کھانا دے جائے گی۔ کھانا اُسکا محبوب، اُسکا خدا تھا۔ اُسمیں ابھی وہ جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا جسے لوگ عشق کہتے ہیں۔ اُسے تو اس لڑکی میں ایک فرشتہ نظر آیا تھا۔ وہ اتنا بھولا تھا کہ وہ یہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ جب ایک لڑکی کسی لڑکے پر مہربان ہوتی ہے تو اس جذبے کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ تو اتنا معصوم اور بھولا تھا کہ اُسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ بورژوائی سماج کیا ہوتا ہے۔ اشترکیت کسے کہتے ہیں۔ حب الوطنی کیا ہوتی ہے۔ آزادی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ ملک برسوں پہلے آزاد ہو مگر اُسے وہ آزادی دکھائی کیوں نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ آزاد تھا تو سیف اللہ نے اُسکی آزادی کیوں چھین لی تھی اور اُسے قیدی کیوں بنا دیا تھا۔ وہ اُسے پیٹ بھر کے روٹی نہیں دیتا تھا۔ اُس سے رات دن کام کرواتا تھا۔ ہر پل اُس پر کڑی نگرانی رکھتا تھا جیسے وہ ایک باغی تھا۔

ہر دوسرے تیسرے دن جب اُسے بھوک ستانے لگتی تھی اور زلیخا سو جاتی تھی تو وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر برتن مانجھنے لگتا تھا۔ اُسکی متلاشی نگاہئیں غزالہ کو ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ غزالہ بھی جیسے اُسکے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ اصل میں غزالہ کو اس من موہنے نوجوان سے یکطرفہ پیار ہو گیا تھا جس کا محبوب کو کوئی علم

نہیں تھا۔ وہ کھانا اپنی ماں کی نظروں سے چھپا کر محبوب تک لے آتی تھی۔ محبوب شدت جذبات سے اپنے آنسو روک نہیں پاتا تھا۔ وہ بس روتا رہتا تھا۔ کھانے کھاتے ہوئے بھی روتا رہتا تھا۔ غزالہ اُسے آنسو بہاتے دیکھ کر تڑپ تو اُٹھتی تھی پر زبان سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ بس والہانہ پن اور وارفتگی سے اس نوجواں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ زلیخا نے غزالہ کو اُسے چوری چھپے روٹی کھلاتے ہوئے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا، گھر میں قیامت آگئی۔ اُسے لگا کہ چھوکری کے قدم بھکنے لگے ہیں اور وہ اس ٹٹ پونجے سے پیار کرنے لگی ہے۔ اُسنے غزالہ کو بالوں سے پکڑ کر اندر کمرے میں گھسیٹا اور پھر اُسکے جھونٹے کھینچ کر وہ اُسے زمین پر گرا کر اُسے لاتوں اور ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔ وہ روتی رہی گڑگڑاتی رہی مگر زلیخا کلیجہ ذرا بھی نہ پسیجا۔ وہ اُسے تب تک مارتی رہی جب تک اُسکے بھائی بہن اُسے چھڑانے نہیں آئے۔ بات سیف اللہ تک پہونچ گئی۔ اُسے لگا کہ یہ لونڈا بڑا احرام خور نکلا۔ جس تھالی میں کھایا اُسی میں چھید کرنے کی سوچنے لگا۔ اُسنے محبوب کی پہلے جم کر پٹائی کی پھر اُسکی ڈیوٹی ریستوراں میں لگادی اور بیوی سے تنبیہ کی کہ وہ اس بات کی ڈانڈی نہ پیٹے کیونکہ اس لونڈے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بدنامی تو ان کی ہی ہوجائے گی۔ محبوب کے لئے یہ سزا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ثابت ہوئی۔ اُسے اس بات کا علم نہ تھا کہ سیف اللہ اُسے انعام نہیں بلکہ سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ اُسے اس گستاخی کے لئے تڑپا تڑپا کے مارڈالنا چاہتا ہے۔ اُسنے دو لونڈوں کی چھٹی کردی اور یہ سب کام اُسنے محبوب کو سونپ دئے۔ وہ صبح چار بجے نیند سے اُٹھتا تھا۔ پورے ریستوراں میں جھاڑو لگاتا تھا۔ اُسکے بعد ڈرموں میں پانی بھر دیتا تھا۔ پانی بھرنے کے بعد وہ بڑی بڑی دیگیں دھوڈالتا تھا۔ آٹھ بجے تک وہ تھکن سے نڈھال ہوجاتا تھا۔ پیٹ کھانا مانگتا تھا مگر وہ کہاں سے ملتا۔ صبح جب دیگیں چولھے پر چڑھ جاتی تھیں تو وہ رسوئیا کے پاس جاکر اُس سے ایک روٹی مانگتا تھا تو وہ اُسے گالی دیکر بھگا دیتا تھا۔ یہاں اُسکا کوئی ان داتا نہیں تھا۔ یہ سب سیف اللہ کے پالتو کتے تھے جو اُسکے اشارے پر بھونکتے تھے۔

وادی کے حالات کچھ دنوں سے دگر دوں چل رہے تھے۔ ایک دن پہلگام میں بھی ہڑتال ہوگئی۔ سارے نوکر ہوٹل بند کر کے اندر ہی پڑے رہے۔ اتنے میں سڑک پر پولیس اور بھیڑ کے بیچ جھڑپ

شروع ہوگئی۔ محبوب نے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو سیف اللہ نے اُسے مادر زاد گالی دی۔ اس گالی سے اُس کی روح تڑپ اُٹھی۔ اُسے لگا جیسے سیف اللہ نے اُسکے کانوں میں تیز آب انڈیل دیا ہو۔ پہلی بار اُسکا خون کھول اُٹھا۔ اُس کا جی چاہا کہ سیف اللہ کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ لگا دئے۔ اسی بیچ فضا میں نعرے گونجنے لگے۔ ہم کیا چاہتے آزادی۔ ہم کیا چاہتے آزادی''

اس نعرے کے ساتھ ہی جیسے کسی بلوائی کی روح اُسکے اندر حلول کرگئی۔ وہ سرعت سے اُٹھا۔ پوری طاقت سے چلایا۔

''ہم کیا چاہتے آزادی'' اسی کے ساتھ وہ پچھواڑے کے راستے بھاگ گیا۔ وہ جب اگواڑے میں آ گیا تو وہاں بھاری بھیڑ تھی۔ اُسنے ایک پتھر اُٹھا کر ہوٹل کے شٹر پر مارا بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی اور اُسکے بعد ہوٹل پر تابڑ توڑ پتھر برسنے لگے۔

محبوب علی نالہ لیدر کو پار کرتا جا رہا تھا۔ نالے کے چیخ چنگھاڑ کے باوجود اُسے سیف اللہ کے ہوٹل پر پڑے پتھروں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

# کرن نگر کا شمشان

خدا کے کارخانے میں سے ہر طرح کے آدمی بن کر نکلتے ہیں۔ کچھ رحمدل، کچھ بزدل، کچھ خدا ترس اور کچھ مغرور، کچھ عاقل اور کچھ ہونق، کچھ سخی تو کچھ لٹیرے۔ کچھ سندر تو کچھ بدرو۔ علی مشران بھی اُسی کارخانے کی پیداوار تھا جس کو دیکھ کے ہی لوگوں کو وحشت ہو جاتی تھی۔ وہ بھی کمال کا آدمی تھا۔ اُسے آج تک کسی نے روتے ہوئے دیکھا تھا نہ ہنستے۔ وہ تمام تر انسانی جذبات سے عاری تھا۔

علی مشران اصل میں کرن نگر شمشان کا چوکیدار تھا جس کے شب و روز اسی شمشان گھاٹ میں گزرتے تھے۔ عام لوگ رات ہونے کے بعد اس شمشان کے آس پاس بھی پھٹکتے نہیں تھے۔ کیونکہ لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ اس شمشان کے اور ے دھورے میں طرح طرح کی الائیں بلائیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان جب کبھی بھی اتفاقاً اس شمشان کے سامنے سے رات کے وقت گزرتا تھا تو مسلمان آیت الکرسی اور ہندو ہنومان چالیسا کا ورد کرنے لگ جاتا تھا۔ آدمی چاہے جس قوم یا فرقے سے ہو موت سے ہمیشہ خائف رہتا ہے۔ باہر سے وہ جتنا بھی مظبوط اور توانا دکھائی دے اندر سے وہ اُتنا ہی کمزور اور ڈرپوک ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اُسے موت ڈراتی ہے۔ اس شمشان کے اندر کیا ہو رہا ہے یہ بہت کم لوگ جانتے تھے مگر اس شمشان گھاٹ کی ایسی دہشت تھی کہ دن میں بھی لوگ یہاں سے گزرتے ہوئے ڈر جایا کرتے تھے ۔ اس شمشان کو چار اور سے چنار کے پیڑوں نے ایسے گھیر کے رکھا تھا کہ دن میں بھی یہاں چناروں کے گھنے سایے کی وجہ سے نیم اندھیرا سا چھایا رہتا تھا۔ اس نیم تیرگی کی وجہ سے یہاں کا ماحول کافی خوفناک اور ڈراونا ڈراونا سا لگتا تھا۔ نہ جانے علی مشران کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ وہ اس ڈراونے ماحول سے قطعی خوفزدہ نہ تھا۔ طرفہ یہ کہ وہ اس مسان میں خوشی خوشی رہ رہا تھا۔ وہ اس ماحول میں ایسا رچ بس گیا تھا کہ یہاں سے باہر نکلتے ہی اُسکا من بے چین اور بیاکل ہونے لگتا تھا۔ درحقیقت وہ مردے کے ساتھ رہنے کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ اب اُسے مردوں سے نہیں بلکہ زندہ انسانوں سے ڈر لگتا تھا۔

واسدیوا سی شمشان کے قرب میں کرن نگر کے علاقے میں رہتا تھا۔ اُس کی اپنے گھر کے پاس ہی ایک بڑی سی پرچون کی دوکان تھی جہاں سے علی مشران ہر ہفتے سوداسلف خرید کر لے جاتا تھا۔ وہ یہاں بچپن سے آیا کرتا تھا اس لئے پارچہ فروش واسدیو کے ساتھ اُس نے خاصے مراسم بنا کر رکھے تھے۔
واسدیو جسے پیار سے لوگ واسہ کاک کہہ کر بلایا کرتے تھے اس علاقے میں خاصا مقبول تھا۔ وہ تھا بھی بڑا حلیم، نیک اور ایماندار آدمی۔ ایک پائی کی پھیر پھار بھی اُسکے یہاں ممکن نہ تھی۔ وہ کم منافع کمانے میں یقین رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے یہاں ہمیشہ گراہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ علی مشران کو وہ بچپن سے جانتا تھا اسلئے وہ اُسے بچے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ جو کام کر رہا تھا اُسنے اُسے واسدیو کی آنکھ کا تارا بنا کر رکھ دیا تھا۔

واسدیو کے دو بیٹے تھے۔ رتن لال اور کشن لال۔ بڑا شادی شدہ تھا جب کہ چھوٹا ابھی تک کنوارا تھا۔ رتن لال محکمہ مال میں ملازم تھا جب کہ کشن لال ابھی تک بے روزگار تھا۔ رتن لال کی بیوی کا نتا بڑی نک چڑھی تھی۔ ہمیشہ اپنی ساس ارون دتی کیساتھ اُسکی لے دے چلتی رہتی تھی۔ جب واسدیو شام کو گھر لوٹتا تھا تو بیوی شکایتوں کے دفتر کھول کے بیٹھ جاتی تھی۔ ایک طرف بیوی اور دوسری طرف بہو۔ وہ کس کی طرفداری کرے اور کس کی نہیں یہ فیصلہ لینا اُسکے لئے بڑا مشکل ہوتا تھا۔ رتن لال کماؤ تھا۔ جب سے وہ سرکاری ملازم ہو گیا تھا اُسکے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ بیوی نے اُسے ایسے بس میں کر لیا تھا کہ وہ جورو کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اُسے اپنی اُنگلیوں پر نچاتی تھی۔ رتن لال کان کا کچا تھا جو کچھ بیوی اُسکے کان میں پھونکتی تھی وہ اُسی کو سچ مان لیتا تھا۔ ماں کی تو وہ آدھی بات نہ سنتا تھا۔ بیچاری ارون دتی کی کوئی قدر رہی نہ رہ گئی تھی۔ واسدیو اسلئے رتن لال سے کچھ نہیں بولتا تھا کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کے نہ چلا جائے اس لئے واسدیو ایک کان گونگا اور ایک کان بہرہ کر کے بیٹھتا تھا۔ اُسے تو بس کشن کی فکر کھائے جارہی تھی کہ وہ کب تک گھر میں بے کار اور بے روزگار پڑا رہے گا۔ وہ بھی آدھ سیر آٹے سے لگ جاتا تو وہ اُسے بھی ٹھکانے لگا کر چار دھام کی تیرتھ پر نکل جاتا۔
ایک دن اُسکی مراد پوری ہوئی کشن لال بھی روزگار سے لگ گیا۔ نوکری ملتے ہی کانتا نے اُسے

گھیرنا شروع کیا۔ اُسکی ایک چھوٹی بہن تھی جس کا بیاہ نہیں ہو رہا تھا۔ یوں تو وہ بڑی خوبصورت تھی پر ایک کسر تھی وہ یہ کہ وہ ٹنڈی تھی۔ کانتا نے کشن لال کو ایسے اپنے بس میں کرلیا تھا کہ وہ بس کانتا کے گن گاتا رہتا تھا۔ قبل اسکے کہ بیل منڈھے چڑھ جاتی اچانک ایسی آندھی اُٹھی جس نے بسے بسائے گھر ہی اُجاڑ دئے۔

کشمیر میں ایسی اُتھل پتھل مچی جس نے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی لوگوں سے سلب کی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آئے دن معصوم اور نہتے لوگ کیوں مر رہے ہیں۔ اقلیتی فرقے کے لوگ نقل مکانی کیوں کر رہے ہیں۔ تشدد کا ایسا دور دورہ تھا کہ لوگ اپنے آپ کو اپنے گھروں میں بھی محفوظ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ اس خوف دہشت کا شکار سب سے زیادہ اقلیتی فرقہ تھا جو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ جب کرن نگر کے بیشتر نواسی گھر چھوڑ کے چلے گئے تو واسدیو کے دونوں بیٹے بھی پر پھڑ پھڑانے لگے۔ اُنہوں نے اپنے باپ پر دباو ڈالنا شروع کیا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی دکان کسی کو بیچ دے اور اُن کے ساتھ جموں نکل چلے۔

واسدیو کے لئے اپنی دکان بیچنا ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنی اولاد کو بیچنے جارہا ہو۔ وہ کسی دباو میں آنے والا نہ تھا سو اُسنے بچوں سے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر دکان نہیں بیچے گا۔ ایک شام کسی شر پسند نے اُسکے مکان کے سامنے بم دھماکہ کر دیا۔ یہ دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ گھر کے سارے شیشے ٹوٹ گئے۔ دیواروں میں دراریں پڑ گئیں۔ واسدیو کے اٹل ارادے ڈگمگانے لگے۔ وہ اندر ہی اندر سے دہل کر رہ گیا۔ اب کے بیوی بچے اُسکے سر پڑ گئے کہ وہ جتنا کچھ سمیٹ سکتا ہے سمیٹ لے اور اُنکے ساتھ نکل لے۔ واسدیو کو لگ رہا تھا جیسے اُسکے بچے اُسے دار پر چڑھانے جا رہے ہوں۔ وہ اپنے گھر، اپنے لوگوں سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا مگر حالات اُسکے حق میں نہ تھے۔ تاہم اُس نے اپنی جمع شدہ پونجی وہیں رہنے دی۔ اُسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ یہ شورش زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ پائے گی اسلئے بادلِ نخواستہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہولیا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ بہت جلد وہ اپنے گھر لوٹ کر آئے گا۔

واسدیو پورے سفر میں بن آب مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ گھر سے جدا ہونے کی کسک اُسے اندر ہی اندر لہولہو رلا رہی تھی۔ وہ اُسے جموں لے کر آگئے۔ بن تلاب کے گنجان علاقے میں اُنہوں نے ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا اور سب کو بھیڑ بکریوں کی طرح اس چھوٹے سے کمرے میں ٹھونس دیا۔ واسدیو کو لگا

جیسے کسی نے جیتے جی ہی اُسے نرک میں ڈالدیا ہو۔ کہاں اُسکا گھر جہاں رہنے کے لئے اُسکے پاس دس کمرے تھے اور کہاں یہ کمرہ جہاں وہ ٹھیک سے پاؤں بھی نہیں پھیلا پاتے تھے۔ سب سے زیادہ پریشانی تو کانتا کو ہو رہی تھی۔ وہ ایکساتھ رہنے کے حق میں نہیں تھی۔ رتن لال اُسے اپنی تنگ دستی کا واسطہ دیکر چپ کرالیتا تھا۔ دو دن وہ چپ ہو جاتی تھی، پھر تیسرے دن وہ وہی رونا لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ رتن لال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے اپنی بیوی کو مطمین کرلے۔

اُدھر کشمیر کے حالات دن بہ دن ابتر ہوئے جا رہے تھے۔ جو کشمیری ہندو وہاں رہنے کی ہمت کر پائے تھے اُن میں سے کئی ایک تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ جب سنگرام پورہ کا قتل عام ہوا تو واسدیو کو اُس دن لگا کہ واقعی کشمیر اب قتل گاہ بن کر رہ گیا ہے جہاں کسی کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر دلاسہ دیتا رہا کہ جلدی ہی حالات پہلے جیسے ہو جائیں گے اور وہ ایکبار پھر اپنے اپنے گھروں میں چین سے رہ پائیں گے۔ وہ بھی اوروں کی طرح اُمید فردا پر جیتا رہا۔ بس وہ ہر دن سری نگر جانے والے بس اڈے پر بیٹھا رہتا تھا اور حسرت بھری نظروں سے سری نگر جانے والے مسافروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اُسکے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی تھی اور وہ سوچنے لگتا تھا کہ آخر اُسے کس گناہ کی پاداش میں اپنے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا کہ روح کو جسم سے الگ کر دیا گیا۔

وقت بدلتے ہی انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ بہت جلد گلہری رنگ لائی۔ رتن لال اور کشن لال اپنے باپ پر دباؤ ڈالنے لگے وہ اُنہیں جموں میں مکان خریدنے کے لئے پیسے دے یا اُنہیں کرن نگر کا گھر بیچنے کی اجازت دے۔ واسدیو اپنی زندگی بھر کی پونجی کشمیر میں ہی مصلحتاً چھوڑ کے آیا تھا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ اپنی اولاد پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار اُسنے اپنے بچوں کے ہاتھ میں اپنی زندگی بھر کی کمائی دے دی تو پھر وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ اُسکے مسلسل انکار کرنے پر رتن لال اور کانتا کا واسدیو اور ارون دتی کے تئیں موہ بھنگ ہو گیا۔ وہ اب اُنہیں ایک بوجھ کی طرح لگنے لگے۔ جب تک واسدیو بچوں کی مانگیں پوری کرتا تھا وہ اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اب جب کہ اُسنے ہاتھ کھینچ لئے تھے، بچوں کو اُسکا وجود ہی اکھرنے لگا تھا۔ جب تک ایک گائے دودھ

دیتی رہتی ہے اُسکی لاتیں بھی بھلی لگتی ہیں۔ جب یہی گائے دودھ دینا بند کرتی ہے تو گھر والے اُسے ڈنڈے مارنے لگتے ہیں۔ یہی حال واسدیو کا تھا۔ وہ اب اُنکے کسی کام کا نہیں تھا۔ کہتے ہیں بے فیض اگر یوسف ثانی ہے تو کس کام کا۔ واسدیو اور ارون دتی اب کسی کام کے نہیں تھے اسلئے رتن لال اور کانتا اُنہیں کب تک جھیل پاتے۔ کانتا کو تو یہ دونوں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ وہ جتنا اُنہیں کھانے کو نہیں دیتی تھی اُس سے زیادہ اُنہیں کڑوی کسیلی سنانے بیٹھ جاتی تھی۔ واسدیو کا جی کرتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُسی میں سما جائے۔ دونوالوں کے بدلے اُسے کتنی جلی کٹی سننی پڑتی تھی۔ بچوں کے اس رویے سے اُسکا دل وجگر کرچی کرچی ہوکر رہ جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اُلٹی چھری سے اُسے ذبح کئے جا رہا ہو۔ دو دو بیٹے ہونے کے باوجود اُنہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے اولاد ہوں۔ ستم یہ کہ باپ کے نام پر اُنہیں جو سرکاری امداد ملتی تھی وہ بھی دونوں بھائی خود ہی ڈکار لیتے جب کہ ماں باپ دھیلی دمڑی دیکھنے کے لئے ترستے تھے۔ اسی بیچ دونوں بھائیوں نے ایکدن بنا بنایا مکان جموں میں خرید لیا۔ واسدیو حیران تھا کہ آخر اُن کے ہاتھ یہ قارون کا خزانہ کہاں سے لگا۔ کل تک تو یہ پائی پائی کے لئے روتے تھے اچانک اتنی بڑی رقم انکے پاس کہاں سے آگئی۔ وہ نئے مکان میں منتقل ہوگئے۔ واسدیو نے سوچا شاید اب اُسکی مصیبتوں کا انت ہونے والا ہے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اُنہوں نے ماں باپ کو ایک چھوٹی سی کوٹھری رہنے کو دی جہاں ہوا کا گزر ہی نہیں تھا۔ خود کی گزران میں کوئی کمی نہ رہتی تھی جب کہ ماں باپ کو ایک ایک نوالے کے لئے ترساتے تھے۔

جب بات حد سے تجاوز کر گئی تو ایک دن واسدیو نے اس زندان سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ گھر لوٹ جانا چاہتا تھا۔ سگے سمبندھیوں کو جب اس بات کی بھنک لگ گئی تو اُنہیں اُسکی عقل پر ترس آنے لگا۔ کشمیر لوٹ جانے کا مطلب اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا تھا۔ اُنہوں نے اُسے بہترا سمجھایا کہ وہ اپنی جان پر کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ ابھی حالات ایسے نہیں کہ وہ جاکر اپنے گھر میں رہ سکے۔ واسدیو دل جلا تھا۔ اُسکے درد سے کوئی واقف نہ تھا۔ یہ وہ درد تھا جو غیروں نے نہیں بلکہ اپنوں نے اُسے دیا تھا۔ وہ سب کی تاویلیں سنتا اور پھر جل کر کہتا۔

''میں یہاں بھی کہاں جی رہا ہوں۔ یہاں بھی تو روز روز مر رہا ہوں۔ روز روز مرنے سے اچھا

ہے نا کہ اپنے گھر میں جا کر ایک بار مروں۔''

جو اُسے سمجھانے آئے تھے وہ اُسکا جواب سن کر بغلیں جھانکنے لگے کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ لوگ بڑے بے مروت بن گئے تھے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں آدمی، آدمیت بھول گیا تھا۔ وہ اخلاقی پستیوں میں گر چکا تھا۔ یہ ابتذال کا دور تھا۔ اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل چکا تھا۔ جو کوئی جی رہا تھا اپنے لئے جی رہا تھا۔ اس آپا دھاپی میں کسی سے کوئی توقع رکھنا بھی بے سود تھا اس لئے واسدیو نے اس نرغے سے نکلنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ یک روز وہ گھر سے بھاگ گیا۔ جانے سے پہلے اُسنے اپنی بیوی ارون دتی کو اپنے سامنے بٹھایا اور اُسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''اب مجھ سے بیٹوں کی بے رخی دیکھی نہیں جاتی۔ اپنی بہو کے طعنوں سے میرا جگر چھلنی ہو چکا ہے۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے رتن کی ماں۔ مجھ سے اپنی نہ تمہاری بے عزتی سہی جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا۔ مرنا جینا پرماتما کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرا مرنا وہیں لکھا ہے تو اُسے کون ٹال سکتا ہے۔ بس تم اتنا سا کرم مجھ پر کر لو۔ تم اور کچھ دن یہاں پر جیسے تیسے نکال لو۔ اگر مجھے لگا کہ وہاں کی زمین میرے لئے تنگ ہو چکی ہے تو میں پہلی گاڑی پکڑ کر چلا آؤں گا اور اپنے ساتھ وہ پونجی بھی لے کر آؤں گا جو میں نے پائی پائی کر کے جوڑ کے رکھی تھی شاید اسی برے وقت کے لئے۔ ایک بار وہ روپیہ پیسہ میرے ہاتھ میں آنے دو پھر دیکھنا میں تمہیں کتنا سکھ دوں گا۔ میں آ کر تمہیں اس زندان سے نکال دوں گا اور پھر ہم بھی ایک خوشحال زندگی جئیں گے۔ جب تک میرا انتظار کرنا۔ میں جانتا ہوں کے میرے پیچھے یہ لوگ تمہیں اور زیادہ دکھ دیں گے۔ بار بار تمہاری چھاتی پر مونگ دلتے رہیں گے، تم بس اتنا کرنا کہ اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ان لوگوں کی جلی کٹی سنتی رہنا۔ کبھی اپنے دل پر کوئی بوجھ مت لینا۔ ایک سے دن صدا نہیں رہتے۔ کہتے ہیں بارہ برس کے پیچھے گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ یہ تو وقت کا ہیر پھیر ہے۔ پھر وہی دن لوٹ کر آئیں گے جب تم اپنے گھر میں پھر سے راج رانی بن کر راج کرو گی۔''

واسدیو کی باتیں سن کر ارون دتی اپنے شوہر کے کاندھے پر سر رکھ کر بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ واسدیو نے اُسکے آنسو پونچھے اور اُسے دم دلاسہ دیکر نکل گیا۔ کانتا نے اُسکے جانے کی خبر سن

کر سجدہ شکر بجالایا جب کہ اس خبر سے بچوں کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ آئی۔ اُنہوں نے اپنے باپ کو ڈھونڈنے میں کوئی پہل نہ کی۔ نہ پولیس تھانے میں شکایت درج کرائی اور نہ ہی خود کوئی دھوڑ دھوپ کی۔

واسدیو اُسی رات سری نگر پہونچا۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے بے صبر ہوئے جارہا تھا۔ جب واسدیو اپنے گھر پہونچا تو یہ دیکھ کر اُسکے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا کہ اُسکے گھر میں کوئی اور رہ رہا تھا۔ ستم در ستم یہ جب اُسے پتا چلا کہ اُسکا گھر اُسکے بچوں نے بیچ ڈالا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اُنہوں نے دھوکے سے اُسکے دستخط لے کر مکان کا سودا کیا تھا اور اُنہی پیسوں سے اُنہوں نے جموں میں مکان خریدا تھا۔ یہ ایک اور چرکہ تھا جو اُسکے دل کو لگا تھا۔ اُس نے جب اس سودے کے خلاف احتجاج کیا تو وہ آدمی ایک ہاتھ میں کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور لے کر واسدیو کے سر پر کھڑا ہوا۔ واسدیو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ تیورا کر گرا۔ اُسنے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ وہ تاراں وہراساں جونہی کرن نگر مارکیٹ سے گزرنے لگا تبھی کئی محلے والوں نے اُسے پہچان لیا۔ اُنہوں نے اُسکی آمد پر خوشی کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی اُس سے ناراضگی کا اظہار کیا کہ اُسنے اپنا آبائی مکان ایک غنڈے کے ہاتھوں بیچا۔ وہ کسے اپنا دکھڑا سناتا۔ کس منہ سے اپنے بچوں کے کرتوت بیان کرتا۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھا اور پھر سڑک کے کنارے بیٹھ کر زاروقطار رونے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسکی اولاد اُس سے اتنا بڑا وشواس گھات کرے گی۔ وہ بہت دیر تک وہیں پر بیٹھ کر اپنی بربادی کا سوگ مناتا رہا۔ اس بیچ ساری سڑکیں ویران ہوگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر شہر خموشاں میں تبدیل ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ ہر طرف ایک ہو کا سا عالم طاری ہوگیا۔ اسقدر سناٹا دیکھ کر اُسکے دل میں ہول اُٹھنے لگا۔ وہ بدحواسی میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ رات نے اپنے گھیسو پوری طرح کھول دئے تھے اور سری نگر کا یہ شہر تاریکی کی ردا لے کر سو گیا تھا۔ واسدیو کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ وہ آج کی رات گزارے تو کہاں گزارے۔ اُس نے کئی دروازے کھٹکھٹائے مگر کوئی در نہیں کھلا۔ اُس کے پاس اب سر چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ وہ کہاں جا کر رات بسر کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے اُسی شمشان گھاٹ کے پھاٹک تک پہونچ گیا جس شمشان کے نام سے ہی اُسکا دل ڈولنے لگتا تھا۔ وہ اسقدر بدحواس تھا کہ اُسے

ہوش ہی نہ رہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اتفاق سے علی مشران پھاٹک بند کرنے کے لئے باہر نکل آیا۔ گیٹ کے باہر کسی کو بیٹھے دیکھ کر وہ ایک پل کے لئے ٹھٹھک گیا۔ اُسے لگا کہ کوئی گھات لگا کر بیٹھا ہے۔ جب بہت دیر تک اس ہیولے میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو علی مشران جی کڑا کر کے اُس کے قریب چلا گیا۔ اُسنے ماچس کی تیلی جلا کر جو دیکھا تو واسدیو کو دیکھ کر وہ حیرت و مسرت سے اُچھل پڑا اور وہ فرطِ جذبات سے چیخ کر بولا۔ ''ارے واسہ کاکا تم یہاں۔؟''

واسدیو نے جب علی کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو اُسکا دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ ایک پل کے لئے آنکھوں کو یقین ہی نہیں آیا۔ علی مشران بے ساختہ اُس سے لپٹ گیا اور دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے رہے۔ علی نے اُسکے ہاتھوں کا بوسہ لے کر پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ۔ تم جموں سے کب آ گئے اور گھر جانے کی بجائے یہاں دروازے پر کیوں بیٹھے تھے؟''

واسدیو نے اپنے آنسو پونچھے اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں اپنے اُسی گھر میں لوٹ کر آیا تھا، جو کل تک میرا تھا۔ پتا چلا اب یہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرے کم ظرف بچوں نے اسے بیچ ڈالا ہے۔ بے گھر کر دیا اُن کمینوں نے مجھے۔ اب میرے پاس سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں۔ سوچتا ہوں کہ اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔''

''جانا کہاں ہے۔ میرے پاس جگہ ہے نا۔ تم میرے ساتھ رہو گے اگر تم رہنا پسند کرو گے۔''

''کہاں اس شمشان میں؟'' واسدیو نے ایسے چونک کر پوچھا جیسے وہ اُسے چتا پر چڑھانے آیا ہو۔ ''نہیں نہیں۔ میں ایک پل کے لئے بھی اس شمشان میں نہیں رہ سکتا''

''معاف کرنا کاکا۔ آج گھروں سے زیادہ یہ شمشان محفوظ اور پر سکون ہے کیونکہ یہاں پر مردے رہتے ہیں۔ مردے جو دل میں کوئی بغض نہیں رکھتے۔ جن کے اندر کوئی حرص و ہوس نہیں ہوتی۔ جنہیں نہ جائیداد کا کوئی لالچ ہوتا ہے نہ اقتدار کی بھوک۔ تم چلو میرے ساتھ۔ پھر دیکھو تمہیں کتنا سکون ملے گا یہاں۔ یہاں کوئی تمہیں ضرر نہیں پہونچائیگا۔ یہاں کوئی تمہارا دل نہیں دکھائے گا۔ یہ سب مردے ہیں

۔مردے کسی کا دل نہیں دکھاتے اور نہ ہی کسی کو کو دکھ پہنچاتے ہیں۔"

کافی کدوکاوش کے بعد علی واسدیو کو اندر لے جانے میں کامیاب ہوا۔واسدیو کا دل جیسے حلق میں آکر پھنسا تھا۔اُسے ہر شے ڈراونی اور بھیانک لگ رہی تھی۔وہ گرتے پڑتے علی کے کمرے تک پہونچا۔علی نے ترت پھرت ایک گدیلا بچھا دیا اور واسدیو کو اُس پر لیٹنے کے لئے کہا۔واسدیو لیٹ کیا گیا کہ لیٹتے ہی اُسکی آنکھ لگ گئی۔صبح وہ اُٹھا تو اُسکے دل سے سارا ڈر نکل چکا تھا۔

علی مشران نے ہر طرح اُسکا خیال رکھا۔اُسے کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔اپنوں نے جو زخم اُسے دئے تھے علی مشران نے اُن پر مرہم بھرے پھاہے رکھ دئے۔ایک رات اُسنے علی مشران سے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔وہ اپنی آخری پونجی اُس مکان سے لے آنا چاہتا تھا جو اُس نے اپنے مکان کے صحن میں دبا کر رکھی تھی۔اُسنے علی سے جھوٹ بولا کہ اُسکے کچھ ضروری کاغذات اُسنے اپنے صحن میں دبا کر رکھے یں، جنہیں وہاں سے نکال کر لے آنا ہے۔وہ علی کو رات کے اندھیارے میں اپنے ساتھ لے گیا۔وہ دیوار پھاند کر اندر گھس گئے۔واسدیو نے نیم اندھیرے میں جگہ کی نشاندہی کی۔علی نے پھاوڑے کی مدد سے زمین کھودی اور بہت جلد اُسکے ہاتھ میں وہ پوٹلی آ گئی۔پوٹلی دیکھکر واسدیو بلیوں اُچھل پڑا۔اُسنے علی کو چلنے کا اشارہ کیا۔علی جوان تھا، اُسنے ایک ہی جست میں دیوار پھاند لی۔واسدیو بوڑھا تھا وہ ایک دو بار کوشش کرنے کے باوجود دیوار کو نہ پھاند سکا۔اتنے میں دھم دھم کی آواز سے اندر کوئی جاگ گیا۔واسدیو ہڑبڑا گیا ۔وہ علی کی مدد سے دیوار پھاندنے کی کوشش کرنے لگا۔اتنے میں مکان میں سے کوئی باہر آیا۔اُسکے ہاتھ میں ریوالور تھا۔اُسنے واسدیو کو کوئی چور سمجھا اور گولی چلادی۔گولی ٹھیک واسدیو کو لگی اور وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔

علی نے جب آخری بار اُسے باہر کھینچنے کی کوشش کی تو اُسکے ہاتھ میں صرف پوٹلی آ گئی۔وہ واسدیو کی لاش وہیں پر چھوڑ کر سرپٹ اپنے ٹھکانے کی اور بھاگنے لگا۔جب وہ اشمشان کے قریب پہونچا تو اُسنے پوٹلی کھول کر جو دیکھی تو بہت سارے نوٹ اور سونے کے زیور دیکھ کر اُسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔علی ان زیوروں کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔اس مال غنیم سے اُسکا دلدر دور ہو سکتا تھا اور وہ ایک خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔واسدیو تو مر چکا تھا۔صرف وہ یہ بات جانتا تھا کہ پوٹلی علی کے پاس ہے۔جب

وہی نہیں رہا تو پوچھنے والا کون تھا۔ بہت دیر تک علی اسی کشمکش میں پڑا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ خزانہ اُسکے ایمان کو ڈگمگانے لگا تھا۔ اچانک اُسکی نظر جو سامنے پڑی تو اُسکی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ سامنے ایک آدمی ہاتھ میں ریوالور تانے کھڑا تھا۔

اگلے روز واسدیو کی لاش پولیس کو سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ملی۔ لاش کی شناخت ہوئی اور اُسکے لواحقین کو خبر کردی گئی۔ ارون دتی کشن لال کو لے کر سیا پہ کرتے ہوئے سری نگر پہونچی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد جب اُسے شمشان گھاٹ پہونچایا گیا تو علی غائب تھا۔ اب واسدیو کا کریا کرم کون کرے۔ ارون دتی کھڑی یہ باتیں سوچ رہی تھی کہ اتنے میں علی مشران خون میں لت پت شمشان گھاٹ میں داخل ہوا۔ اُسکی حالت دیکھ کرارون دتی چیخ کر پیچھے ہٹی۔ علی اُسی کے پاس چلا گیا اور اُسکے قدموں میں گر کر بولا۔

''مجھے معاف کر دینا مائی۔ میں تمہارے شوہر کو نہ بچا سکا۔ بس تمہاری اس امانت کو بڑی مشکل سے بچا پایا میں کیونکہ اس پر آشوب دور میں لٹیروں سے دھن دولت کو بچا پانا دل گردے کا کام ہے۔ ہر طرف لٹیرے ہی لٹیرے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ غیر کی چھوڑو، پیسہ دیکھ کر اپنی ہی نیت بگڑ جاتی ہے۔ اچھا ہوا اتنا خون بہا کر میں نے اپنے گناہ کا کفارہ تو ادا کرلیا۔ یہ لو سنبھالو اسے''

کہہ کر وہ ہانپنے لگا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اُسکی روح بھی نفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

# پوش مال

وہ ہماری سگی نانی نہ تھی پھر بھی ہمارے لئے سگی سے کم نہ تھی۔ جب سے وہ ہمارے گھر پر آنے جانے لگی تھیں تو اُسکی آمد آمد کی خبر کے ساتھ ہی گھر میں ہلچل مچ جاتی تھی۔ بڑے کمرے میں موٹا سا مٹرس بچھا دیا جاتا تھا۔ مٹرس کے اوپر کڑھائی کی ہوئی کھدر کی چادر بچھائی جاتی تھی۔ تین اطراف گاؤ تکیے لگا دئے جاتے تھے تاکہ وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ سکے۔ نانی کے آنے سے تو غسل خانے کی قسمت چمک اُٹھتی تھی۔ ایسی گھسائی، دھلائی ہوتی تھی کہ فرش آئینے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ نہانے کے لئے کونے میں گلابی رنگ کی ایک نئی نویلی پیڑھی رکھ دی جاتی تھی تاکہ نانی اس پر بیٹھ کر اشنان لے سکیں۔ صابون کیس میں خوشبودار صابون کی ٹکیہ رکھی جاتی تھی تاکہ اگل بغل کی سڑاند اس خوشبو میں دب جائے۔ ساتھ میں تیل کی شیشی، کنگی، سرمہ سب ایک طاق پہ سجا کے رکھ دیا جاتا تھا تاکہ نانی کو ادھر اُدھر دوڑنا نہ پڑے۔ بدن پونچھنے کے لئے اماں اپنے من کو مار کر ٹرنک سے ایک نئی تولیہ نکال کر باتھ روم میں ٹنگا کے رکھدیتی تھیں۔ جونہی گاڑی کا پوں پوں بجتا تھا تو گھر کی ساری عورتیں یعنی اماں، بھابی، تائی اور چاچی گھونگھٹ نکال کے ادھر اُدھر گرتی پڑتی نظر آتی تھیں جب کہ پتا جی بھاگ کر پھاٹک پر کھڑے ہو جاتے تھے اور نانی کا ہاتھ تھام کر اُن کو ٹیکسی سے باہر لے آتے تھے اور پھر اُنہیں بہ نفس نفیس اندر لے آتے تھے۔ نانی کے پیچھے اُنکا چہیتا کشمیری چھوکرا گلزار نانی کا بڑا سا بیگ اُٹھائے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ جونہی نانی کمرے میں قدم رکھتی تھیں تو گھر کی ساری عورتیں ایک ایک کر کے اُسکے پاوں چھونے کے لئے آگے بڑھتی تھیں۔ نانی سب کو باری باری آشیرواد دیتیں اور ساتھ ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالکر ہر ایک کی ہتھیلی پر ایک ایک روپے کا سکہ رکھ دیتی تھیں۔ نانی کی جیب قارون کے خزانے سے کچھ کم نہ تھی۔ وہ سکے بانٹتے بانٹتے تھک جاتی تھیں پر اُسکی جیب خالی ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

نانی کا اصلی نام پوش مال تھا یعنی پھولوں کی لڑی پر ہم تو اُسے اس نام سے نہیں بلکہ نانی کے نام سے جانتے تھے۔ اُسکے ماں باپ نے شاید اُسکی صباحت اور نزاکت کو دیکھ کر ہی اُسکا نام پوشہ مال رکھ لیا ہوگا۔ وہ واقعی پھول کی طرح نازک اور ملائم تھی۔ لطافت اور خوشبو سے مخمور۔ پاکیزہ اور بے داغ جیسے ابھی کوئی جا کر اُسے بھگوان کی مورتی پر چڑھا کے آئے گا۔ پوشہ مال نے عمر کے پینسٹھ پڑاو پار کئے تھے۔ ان

پینسٹھ سالوں میں اُسنے بڑے اُتار چڑھاو دیکھے تھے۔ اتنے سارے نشیب وفراز دیکھنے کے باوجود وہ زراسی بھی نہ بدلی تھی۔ وہ پہلے جتنی شیریں، شفیق اور مہربان تھی وہ آج بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اُسکے رکھ رکھاو میں اُسکے سوبھاو میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے اُس بادل کا خیال آتا تھا جو رحمت باراں برسا کر آیا ہو اور اب دور کسی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر ستا رہا ہو۔ وہ اکثر خاموش رہتی تھیں کوئی کچھ پوچھتا تو ہوں ہاں میں جواب دیتی تھیں۔ اُسکی آنکھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ان آنکھوں میں درد کا ایک بیکراں ساگر پنہاں ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں جس کا کوئی کنارا نہیں۔ وہ اُس کھیت کی طرح دکھائی دے رہی تھی جس کی فصل کٹ چکی ہو اور اب اُس میں ٹھنٹھ ہی ٹھنٹھ رہ گئے ہوں۔ وہ کافی ظعیف ہو چکی تھی۔ اُسکے چہرے پر وقت سے پہلے جھریاں پڑ گئی تھیں۔ وقت بڑا ستم ظریف ہوتا ہے۔ کبھی بسنت کے میلے لگا دیتا ہے تو کبھی خزاں کے ہاتھوں سب کچھ تحس نحس کر کے رکھ دیتا ہے۔ پوشہ مال بھی وقت کی بے رخی کا شکار ہو چکی تھیں۔ حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے اُسکے چہرے پر یہ جو جھریوں کا جھالر لٹکا دیا تھا اس جھالر میں ایک تاریخ رقم تھی جسے آج تک کوئی پڑھ نہیں پایا تھا۔

پوش مال کی جوانی کا دور بڑے اوج موج کا رہا تھا۔ خوشیوں اور شادمانیوں سے معمور، آسودگی اور سکون سے مملو، آسائشوں اور لطافتوں سے بھرپور۔ اُسنے سچے معنوں میں جیون کا آنند اُٹھایا تھا۔ اُسکے شوہر ماسٹر روگناتھ جی جو کہ انت ناگ کے ضلع مٹن کے باسی تھے۔ اُنکی گنتی اس علاقے کے معزز ہستیوں میں ہوتی تھی۔ پیشے سے ماسٹر تھے اسلئے اس علاقے کا ہر فرد و بشر اُنکی عزت و تکریم کیا کرتا تھا۔ اس علاقے کے بیشتر نوجوان اُنکے شاگرد رہے تھے۔ وہ جدھر سے بھی گزرتے تھے لوگ تعظیم سے کھڑے ہو جاتے تھے اور جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔ ماسٹر جی بہت ہی نیک، خداترس اور خوش طبع آدمی تھے۔ زندگی بھر کبھی اُنہوں نے کسی کی دل آزاری نہیں کی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ماسٹر جی کے اثر ورسوخ کا کچھ لوگوں نے خوب فیض اُٹھایا تھا۔ کون کیا کر رہا ہے اُنہیں ان باتوں سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اگر اُنہیں پتا بھی چلتا تھا کہ فلاں آدمی نے اُنکے نام کا غلط فائدہ اُٹھایا تو ماسٹر جی جواب میں کہتے کہ "اگر کسی کا بھلا ہو رہا ہے تو میرا نام لینے میں کیا قباحت ہے" وہ ایسے بھلے مانس تھے کہ اُن کی بیوی اگر اُن پر کبھی غصہ کرتی تھی تو ایک

بچے کی طرح سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ آج تک کسی نے اُنہیں اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا نہ سنا تھا۔ بہت ہی حلیم اور خوش اخلاق تھے وہ۔ ماسٹر جی خاندانی رئیس تھے۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا اُنکے پاس۔ زمین جائیدادا اونچی حویلی، ڈور ڈنگر، کئی میوہ باغات۔ گھر میں ہر چیز کی فراوانی تھی۔ وہ چاہتے تو بیٹھے بیٹھے ہی اُن کو سب کچھ میسر ہو جاتا مگر دل میں یہ اُمنگ تھی کہ اُس کے علاقے کا ہر بچہ پڑھے لکھے اس لئے اُنہوں نے ماسٹری کا پیشہ اپنایا تھا۔ لوگ اُنکے اس نیک جذبے کی دل سے قدر کیا کرتے تھے۔ ماسٹر جی اپنی بھاگ بھری پر جان چھڑکتے تھے۔ پوش مال نے کبھی بھی ماسٹر جی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ محلے میں جسکو دیکھو وہی پوش مال کے گن گاتا تھا۔ ہر روز پاس پڑوس کی کوئی نہ کوئی عورت اُس سے کچھ نہ کچھ مانگ تانگ کے لے جایا کرتی تھی۔ وہ کسی ایک کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا دیتی تھیں۔ اُسکا دل بڑا کشادہ تھا۔ دوسروں کی حاجت روائی کرنے میں وہ دلی خوشی محسوس کرتی تھیں۔ رشتہ داروں کو تو آئے دن اُسکی یاد ستاتی رہتی تھی۔ وہ سبھی رشتہ داروں کو ایک ہی نظر سے آنکتی تھی چاہے وہ دور کو ہو یا پاس کا۔ وہ کسی کی بھی خاطر مدارت میں کوئی کمی کسر رہنے نہیں دیتی تھی۔ وہ جب جانے لگتے تھے تو پوش مال ان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتی تھیں بلکہ اُنہیں کچھ نہ کچھ سوغات دیکر ہی رخصت کرتی تھیں۔ ایک تو سو پچاس ہاتھ پہ رکھ دئے اوپر سے کسی کو دو کلو اخروٹ تھما دئے۔ کسی کی تھیلی میں چار کلو سیب بھر دئے۔ کسی کو مکئی کا آٹا دے کر خوش کیا تو کوئی دس کلو چاول لے کر نہال ہو گیا۔ غرض جو کچھ بھی گھر میں دستیاب تھا وہ بٹ ہی جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سال بھر چلتا رہتا تھا۔ رشتہ داروں کو یہی لالسا پوشہ مال کے پاس کھینچ کر لاتی تھی۔ کشمیر میں برسوں سے یہ معقولہ چلتا آیا ہے کہ شہر والا گاوں والے سے کہتا ہے کہ تم ہمیں بلاو گے تو کیا کھلاو گے، تم ہمارے گھر آو گے تو کیا لاو گے؟ مطلب یہ کہ گاوں والے کو آتے جاتے کچھ نہ کچھ نذرانہ شہر والے کو ادا کرنا ایک روایت بن گئی ہے۔ یعنی چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ شہر والے دیگر معاملوں میں بھلے ہی سست ہوں مگر گاوں والے سے خراج وصول کرنے میں بڑے تیز رہے ہیں۔ وہ جب شہر سے گاوں آتے ہیں تو خالی ہاتھ آتے ہیں لیکن جب جاتے ہیں تو اپنے ساتھ بہت ساری سوغات لے کر جاتے ہیں۔ جب اُنکے یہاں جاو تو کم سے کم دو چار کلو راجماش، یا آٹھ دس کلو چاول لے کر ہی جانا پڑے گا۔ اگر کوئی خالی ہاتھ گیا تو یہ لوگ اُسے پانی تک کے لئے

نہیں پوچھتے، چاہے وہ کتنا ہی نزدیکی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔

پوش مال اس معاملے میں بڑی ہی حساس اور وضع دار خاتون تھیں۔ وہ یا ماسٹر جی اگر کبھی سری نگر کسی کام سے جاتے تھے اور وہاں پر ایک آدھ رات کسی رشتہ دار کے یہاں گزارتے تھے تو اپنے ساتھ دس طرح کی چیزیں تحفے کے طور پر لے جاتے تھے۔ پوش مال کے بارے میں کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اُس چنار کی طرح ہے جو خود دھوپ میں جھلستا ہے پر ہر تھکے مسافر کو ٹھنڈی چھاوں دیتا ہے۔ کچھ لوگ فطرت سے ہی ایسے ہوتے ہیں جو خود پیاسے رہتے ہیں پر دوسروں کی پیاس بجھانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ پوشہ مال اُن میں سے ایک تھیں۔

ماسٹر جی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام تیج ناتھ تھا اور چھوٹے کا نام راجناتھ تھا۔ ماسٹر جی نے اپنے دونوں بچوں کو خوب پڑھایا لکھایا۔ تیج ناتھ نے سری نگر کی یونیورسٹی سے ایم اے کیا جب کہ راجناتھ نے دلی میں جا کر ایم بی بی ایس کیا۔ تیج ناتھ کو سری نگر میں ہی لیکچرار کی نوکری مل گئی جب کہ راجناتھ مزید پڑھائی کرنے کے لئے لنڈن چلا گیا۔ پوش مال کو تیج ناتھ کے لئے رشتے پہ رشتے آنے لگے۔ وہ اپنے ہی علاقے کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔ دو ایک لڑکیاں اُسکی نظر میں تھیں۔ ماسٹر جی کو بھی وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جب ماں نے بیٹے سے بات کی تو جواب میں اُسے جو کچھ سننے کو ملا اُسے سن کر اُسکے پاوں تلے کی زمین سرک گئی۔ تیج ناتھ نے اپنے لئے پہلے سے ہی ایک لڑکی پسند کر کے رکھی تھی جو سری نگر کے حبہ کدل علاقے کی رہنے والی تھی۔ پوش مال شہری بہو کے حق میں نہیں تھیں۔ شہری لڑکیاں گاوں کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال نہیں پاتی ہیں۔ اُنکی زندگی کا لائف اسٹائل گاوں کے لائف اسٹائل کے ایکدم اُلٹ ہوتا ہے۔ یہاں گائے بھینس کو چارہ ہی نہیں کھلانا پڑتا ہے بلکہ ننگے ہاتھوں سے گھاس گوبر بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ گھر میں دودھیلی گائیں ہوں تو پھر صبح وشام بلوئی لے کر گائیوں کو دوہنا بھی پڑتا ہے۔ کبھی کھیتوں میں کام چل رہا ہو تو چائے ناشتہ لے کر کھیت پر جانا پڑتا ہے۔ سا گزار میں جا کر مزدور کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ کبھی آ کھر کی صفائی کرنی پڑتی ہے تو کبھی کوئی تیج تیوہار ہو تو گھر بھر کی لیپائی، پوتائی کرنی پڑتی ہے۔ یہ سارے کام شہری بہو کے بوتے کے کہاں۔ اسلئے جب تیج ناتھ نے ماں کو اپنا فیصلہ سنایا تو پوش مال کو لگا جیسے

اُسکے بیٹے نے اُسکے منہ پر چانٹا مار دیا ہو۔ وہ کمرے سے نکل کر سیدھے اپنے شوہر کے پاس گئی اور اُسے بھاری من سے یہ خبر سنائی۔ ماسٹر جی کو بھی یہ خبر سن کر گہرا دھچکا لگا۔ وہ اُٹھا اور سیدھے تیج ناتھ کے کمرے میں چلا گیا۔ باپ کو دیکھ کر تیج ناتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ باپ سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ماسٹر جی نے دوٹوک لہجے میں اُس سے کہدیا۔

''آج تک اس گھر کے فیصلے میں لیتا آیا ہوں۔ آگے بھی میں ہی لوں گا۔ تمہارے لئے اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ یہ ہم سوچیں گے تم نہیں اسلیئے جس لڑکی کو تم پسند کرتے ہو، اُسے بھول جاو کیونکہ میرے جیتے جی وہ اس گھر کی بہو نہیں بنے گی اور ہاں اگر تم نے میرے فیصلے کے خلاف جانے کی کوشش کی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ ہم سب کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔''

پہلی بار تیج ناتھ نے اپنے باپ کو غصے کی حالت میں دیکھا تھا پر وہ تو پیار کے نشے میں ایسا ڈوب چکا تھا کہ باپ کی بھبکی کا اُس پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اُسنے باپ کی بات ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے اُڑا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ماں باپ کو کیسے نرم کرنا ہے۔ اگلے روز وہ ڈیوٹی پر نہیں گیا بلکہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑا رہا۔ جب ماں اُسے اُٹھانے گئی تو وہ ایسے لیٹا رہا جیسے بیمار ہو یا کسی کا سوگ منا رہا ہو۔ ماں اُسکی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ فوراً شوہر کو خبر کرنے گئی۔ ماسٹر جی اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ وہ یہ خبر سن کر پریشان تو ضرور ہوئے البتہ اُنہوں نے کوئی فوری ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ حربہ تیج ناتھ اپنی ضد پوری کرنے کے لئے استمال کر رہا ہے۔

ماسٹر جی اس بھرم میں تھے کہ ایک دو دن میں تیج ناتھ کے سر سے یہ پیار کا بھوت اُتر جائے گا مگر ماسٹر جی کا اندازہ غلط نکلا۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ تیج ناتھ جیت گیا اور ماسٹر جی ہار گئے۔ اُسنے اپنی ضد پوری کی اور اپنی من پسند لڑکی کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ ادھر تیج ناتھ نے یہ کارنامہ کیا اور اُدھر راج ناتھ نے نیا گل کھلایا۔ اُس نے ایک میم سے شادی کر ڈالی وہ بھی ماں باپ کو خبر کیئے بنا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ ماسٹر جی اس دوہری مار سے بالکل ٹوٹ کر رہ گئے۔ ایک سال کے اندر اُنکا دیہانت ہو گیا۔ پوش مال پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایسا لگا جیسے روح چلی گئی ہو اور اب بس خالی شریر رہ گیا ہو۔

اُسکی بہو وینا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر پوش مال کڑھ کے رہ جاتی تھیں۔ وہ بس اپنے آپ میں مست رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج سے جیسے اُسکا کوئی لینا دینا ہی نہ تھا۔ اودھو کا لین، نہ مادھو کا دین۔ جب دیکھو ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھی ہے۔ بیچاری پوش مال کو اس عمر میں کام کرنا پڑتا تھا۔ بہو سے کچھ کہتی تھی تو بیٹا بیوی کی حمایت میں آ کے کھڑا ہو جاتا تھا اور ماں کو ہی چار کڑوی باتیں سنا کے جاتا تھا۔ پوشہ مال تو بہو سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ ایک دن تیج ناتھ نے یہ کہہ کر اُسکے سر پر بم پھوڑ دیا کہ اُسکا تبادلہ جموں ہوا ہے اسلئے وہ اپنی بیوی کو لے کر جموں جا رہا ہے۔ اُسنے جھوٹے منہ سے بھی ماں کو ساتھ چلنے کے لئے نہیں کہا۔ پوش مال بیٹے کی اس بے رخی سے بس اپنا من مسوس کر رہ گئی۔

وہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ جنہیں وہ سرمایہ حیات سمجھ بیٹھی تھیں وہ ایک ایک کر کے دغا دے گئے تھے۔ اولاد اتنی کم ظرف نکلے گی یہ بات اُسکے وہم وگمان میں نہ تھی۔ بچوں کی اس بے رخی سے اُسکے سارے سپنے چور چور ہو چکے تھے۔ جینے کی اُمنگ ہی مر چکی تھی۔ وہ پوتے پوتیوں کو کھلانے کی معصوم خواہشیں، وہ بچوں کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھنے کے پنہاں ارمان ایک دھچکے میں زیر وزبر ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اُسے جینے کا کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جی نہیں رہی ہے بلکہ سزا کے دن کاٹ رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ دکھ اور نراشا کا یہ پھیلا ہوا اندھکار اُسے نگل ڈالے اُس نے زندہ رہنے کے لئے ایک نئی راہ تلاش کی۔ ایکدن اسی گاؤں کے مقدم حاجی ولی بٹ یک مسلم لڑکے کو اُس کے پاس لے آیا جس کا نام گلزار احمد تھا، جو نانی کی طرح ہی قسمت کا مارا تھا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے اُسکے ماں باپ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ اُسکے باپ پر یہ الزام تھا کہ وہ دہشت گرد ہے۔ جب حفاظتی دستے اُسے گرفتار کرنے کے لئے اُس کے گھر میں وارد ہوئے تو گلزار کی ماں ہتھیار بند سپاہیوں سے دست وگریبان ہو گئی۔ اُسکی یہ جسارت اُس کے لئے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ گلزار کی آنکھوں کے سامنے اُسکے ماں باپ قتل ہوئے اور وہ منجمد ہو کے کھڑا رہا۔ ایک پل میں وہ یتیم ہو کے رہ گیا۔ اُسکے معصوم خواب ایک لحظ میں چکنا چور ہو کے رہ گئے تھے۔ ایک ثانیے میں اُسکی دنیا لٹ گئی اور وہ اپنے سامنے پڑی دو لاشوں کا نوحہ بھی نہیں کر سکا۔ یہ دونوں ستم رسیدہ

تھے۔اُن دوکسانوں کی طرح جن میں سے ایک کا کھیت سوکھے سے تباہ ہوگیا ہو جب کہ دوسرے کا کھیت طغیانی سے برباد ہوا ہو۔اس سانحے کے بعد اُس کے ہونٹوں کی مسکان چھن گئی۔اُسکی آنکھوں کی چمک فنا ہوگئی۔دو معصوم آنکھیں درد کے بیکراں ساگر میں تبدیل ہوگئیں۔ایک ایسے ساگر میں جسکی کوئی تھاہ نہ تھی۔یہ درد اُسکی روح کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔اب وہ بولتا نہیں تھا۔بس خاموش آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہتا تھا۔شاید وہ اوپر والے تک اپنی خاموش فریاد پہونچا رہا تھا۔مقدم کو یقین نہیں تھا کہ نانی اس لڑکے کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہوگی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پوش مال بڑی کٹر پنڈتانی ہے لیکن جب اُسنے اس مظلوم کی روداد سنی تو اُسکی چھاتی پھٹنے لگی۔کلیجہ منہ کو آنے لگا۔وہ کہتے ہیں نا کہ گھائل کی گت گھائل ہی جانے۔نانی کو لگا جیسے اُسکا غم اس لڑکے کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔جب ممتا جاگ جاتی ہے تو اجنبیت،تعصب،کٹرپرستی کی ساری دیواریں خود بخود ڈھ جاتی ہیں اور پیار و محبت کا اُجالا ان مہیب بادلوں کو چیر کر نکل آتا ہے۔وہ ممتا کے اُبال میں یہ بھول گئی کہ اس لڑکے کا دھرم کیا ہے،اسکا نام کیا ہے۔اُسنے اُسے اپنے سینے سے لگالیا اور اُسے نہ صرف اپنے گھر میں سہارا دیا بلکہ اُسمیں وہ اپنی کھوئی ہوئی اولاد کو تلاش کرنے لگی۔

دونوں حالات کے مارے تھے۔ایک سوکھی ندی تھی تو دوسرا ایک جل دھارا تھا۔دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔نانی اگر گلزار میں اپنے بچوں کو تلاش کرنے لگی تو گلزار بھی اس عورت میں اپنی کھوئی ہوئی ماں کو ڈھونڈنے لگا۔نانی کے ساتھ رہ کر اُسکا غم کچھ کم ہونے لگا۔نانی بھی اسے اپنے بچے کی طرح عزیز رکھنے لگی۔آجتک رشتہ دار اُسکے ہاں چلے آتے تھے،اب وہ بہانے بہانے سے رشتہ داروں سے ملنے جایا کرتی تھیں۔روپے پیسے کی آج بھی اُسکے پاس کوئی کمی نہ تھی اسلئے دل بہلانے کی خاطر وہ نہ صرف نزدیکی بلکہ دور دراز کے رشتہ داروں تک پہونچنے لگی۔رشتہ دار بھی اُسکے آگے پلکیں بچھا دیتے تھے۔وہ ایک رات سے زیادہ کہیں بھی قیام نہ کرتی تھیں۔جہاں جاتی تھیں لینے کی جگہ کچھ نہ کچھ دے کے ہی آتی تھیں۔اُسکے ہاتھ آج بھی کھلے تھے،وہ تو ہمیشہ کشادہ دل رہی تھی۔آج بھی وہ دو دو ہاتھوں سے دھن لٹاتی تھی کیونکہ سخاوت اُسکی فطرت میں تھی۔

پوش مال کے پاس سب کچھ تھا پر دل کی خوشی نہیں تھی۔ من کا سکون نہیں تھا۔ اُسکا جی تو ایکدم اُچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ حسرت سے اپنے بچوں کی تصویروں کو گھنٹوں نہارا کرتی تھیں۔ بچوں کی یاد کلیجے کو بھرمانے لگتی تھی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ آخر اُسکے پیار میں ایسی کیا کمی رہ گئی جو اُسکے بچوں نے اُسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور کبھی آ کر ایک بار بھی اُسکی سدھ نہیں لی۔ وقت آدمی کو کتنا خود غرض اور کمینہ بنا دیتا ہے یہ برا وقت آنے پر پتہ چلتا ہے۔ بیوی کی ایک تال پر شوہر کی دیدوں کا پانی ہی ڈھل جاتا ہے۔ وہ ماں باپ کو کاٹھ کباڑ کی طرح دل سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔ وہ سوچتی تھی تو روتی تھی۔ اُسکا دل سوچ سوچ کے کرچی کرچی ہو کر رہ جاتا تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ دونوں بیٹے ماں کو یکسر بھول گئے۔ وہ دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی لاولد کی طرح جیتی رہی۔ گلزار نے کسی حد تک اُس خلا کو بھرنے کی کوشش کی تھی۔ اب دونوں ایک پل بھی ایک دوسرے کے بنا رہ نہیں پاتے تھے۔ دونوں سیاسی شعبدہ بازیوں سے بے بہرہ تھے۔ دونوں خود غرضی اور بے ایمانی کی کثافت سے پاک تھے۔ وہ تو بس ایک دوسرے کے درد کا مداوا بننے کی جدوجہد میں کوشاں تھے۔ جہاں نفرت اور دہشت کی کالی آندھی نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا، اس گھر میں دو انسان تھے جو پیار کی ایک ننھی سی قندیل اس طوفان میں جلائے بیٹھے تھے۔

کشمیر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ پوش مال کی زندگی پر بھی خوف کے کالے بادل منڈھلا رہے تھے۔ گاؤں والے ہر پل اُسکی خیر خبر لیتے رہتے تھے۔ صبح سے شام تک اُسکے گھر میں لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ کوئی سبزی لے کے آ جاتا۔ کوئی دودھ دینے چلا آتا۔ ہر فرد اپنے اپنے ڈھنگ سے اُسکی مدد کرتا جا رہا تھا اور اُس بھائی چارے کو بنائے رکھنا چاہتا تھا جو کہ صدیوں سے اس وادی کی اساس رہی ہے۔

اُدھر تیج ناتھ کی بیوی وینا جموں میں کرایے کے مکانوں میں رہ رہ کے عاجز آ چکی تھی۔ وہ ایک نیا مکان خریدنا چاہتی تھی جسکے لئے ایک بڑی رقم درکار تھی۔ وہ صبح و شام اپنے شوہر کے سر پر سوار رہتی تھی کہ وہ مٹن جا کر اپنی جائیداد بیچ کر آ جائے۔ تیج ناتھ کئی مہینوں تک بیوی کو ٹالتا رہا لیکن جس دن اُسے معلوم پڑ گیا

کہ اُسکی ماں نے ایک مسلم لڑکے کو گود لیا ہے اور وہ اپنی ساری جائیداد اُسکے نام کرنا چاہتی ہے تو اُسکے سینے پر سانپ لوٹنے لگے اور وہ رات دن انگاروں پر لوٹنے لگا۔ ایک دن وہ اننت ناگ کے رجب دلال سے ملا اور اُس سے اپنے حصے کا سودا اونے پونے دام میں کرڈالا۔ رجب دلال بیعانہ بھی دے کر چلا گیا۔ جب وہ مٹن جاکر پٹواری کے ساتھ اُس زمین کی پیمائش کرنے پہونچا تو پوش مال کے سارے پڑوسی گھروں سے نکل آئے اور اُنہوں نے رجب دلال اور پٹواری کو گھیر لیا۔ پٹواری لوگوں کے اس جم غفیر کو دیکھ کر گھبرا گیا ۔رجب دلال بھی گاوں والوں کے غصے کو دیکھ کر ڈھیلا پڑ گیا اور وہ ٹیکسی پکڑ کر سیدھے تیج ناتھ کے پاس پہونچ گیا اور اُسے سارا ماجرا سنا دیا۔ تیج ناتھ کا خون کھول اُٹھا۔ وینا تو پہلے سے ہی اپنی ساس کی جان کی دشمن بنی ہوئی تھی اب تیج ناتھ بھی اپنی ماں کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اُسنے رجب دلال سے مدد مانگی۔

رجب دلال کے پاس سو مرض کی ایک ہی دوا تھی۔ پیسہ دیکر بڑھیا کا کام تمام کروا دینا۔ جائیداد کی لالچ میں تیج ناتھ یہ سودا کرنے پر تیار ہو گیا۔

ایک رات جب ایک بندوق بردار پوش مال کے گھر میں ملک الموت بن کے پہونچا تو ننھا گلزار نانی کے بغل میں لیٹا ہوا تھا۔ باہر بڑی خوف ناک رات تھی اور اندر معصوم گلزار کے دل میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اُسے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب اُسکے ماں باپ خون میں لت پت اُسکی آنکھوں کے سامنے پڑے تھے اور وہ رو بھی نہیں پایا تھا۔ وہ اسی طوفان سے لڑتا جا رہا تھا کہ اچانک اُسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُسکے کان کھڑے ہو گئے اور وہ ایکدم اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب اُسکی نظر بندوق بردار پر پڑی تو ایک پل کے لئے اُسکا خون سوکھ کے رہ گیا۔ اگلے ہی پل اُسنے نانی کو جگانے کی کوشش کی۔ گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ گلزار نے دیکھا کہ بندوق بردار نے آگے بڑھکر نانی کی طرف نشانہ باندھ لیا۔ گلزار کو لگا کہ وہ ایکبار پھر یتیم ہونے جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ گولی چل جائے وہ ڈھال بن کے نانی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد گولیوں کی آواز نے رات کے سناٹے کو چیر ڈالا۔ آواز سن کر سارا گاوں جاگ گیا اور پھر لوگ لشتم پشتم گھروں سے نکل کر پوشہ مال کے گھر کی طرف دوڑنے لگے۔ وہاں کا نظارہ دیکھ کر ہر کوئی سن ہو کے رہ گیا۔ پوش مال اپنے سر پر خاک ڈالے گلزار کے بے جان جسم کو اپنی گود میں لے کر ایسے بیٹھی تھی جیسے آج اُسکی حقیقی اولاد کی موت ہوئی ہو۔

☆☆☆

## مصنف کی دیگر تصانیف

1 کشمکش (ناولٹ) پرواز پبلکیشنز۔لدھیانہ جنوری 1970

2 تماشہ (ناول) روحی پبلکیشنز۔کشمیر 1975

3 نیا سفر (ناولٹ) روحی پبلکیشنز۔کشمیر مئی 1977

4 ترنگ (ناول) کتاب والا پبلکیشنز پہاڑی بھوجلہ دلی 1978

5 دردانہ (ناولٹ) کتاب والا دہلی۔ 1989

6 برف کی آگ۔ (افسانوی مجموعہ) رہبر کارنر۔پہاڑی بھوجلہ دہلی ٦ 2001

7 ہم تیرے ہو گئے (ناولٹ) راہی کتاب گھر۔شاہدرہ دہلی۔ 2005

8 دلیپ صاحب (ناسٹلجیا) پرائم ٹائم پبلکیشنز۔لاہور نومبر 2008

9 پمپوش (افسانوی مجموعہ) راہی کتاب گھر۔شاہدرہ دہلی ٣٢ 2011

10 چالاک سوداگر (بچوں کی کہانیاں) رحمانی پبلکیشنز۔مالیگاوں 2011

11 لال پل کا دیوانہ (افسانوی مجموعہ) جواہر پبلکیشنز ممبئ 2014

12 سلام دین کا ہاوس بوٹ (ناول) میزان پبلشرس۔سری نگر۔کشمیر 2015

13 میرے گاوں کا چنار (افسانوی مجموعہ) میزان پبلکیشن۔کشمیر 2016

14 ہم تیرے ہو گئے (ہندی ناولٹ) جواہر پبلکیشنز۔ممبئ 2016

## میرے سفر کے ساتھی

روزنامہ۔ تیج دہلی، روزنامہ۔ پرتاپ۔ دہلی، روزنامہ ملاپ دہلی۔ چتر اویکلی۔ دہلی، ماہنامہ کھلونا۔ دہلی، ماہنامہ۔ بانو۔ دہلی، پندرہ روزہ، واقعات۔ دہلی، ادبی ڈائجسٹ، ہما۔ ماہ نامہ۔ خاتون مشرق دہلی، پندرہ روزہ کہکشاں۔ بمبئی۔ بنت حوا۔ بمبئی۔ مستانہ جوگی، دہلی۔ فلمی تصویر، حیدرآباد۔ ماہنامہ پیکر حیدرآباد۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد۔ ماہنامہ شاخسار کٹک، ادبی ڈائجسٹ۔ ملاقات دہلی۔ ماہنامہ شاعر بمبئی۔ ماہنامہ فلمی ستارے دہلی۔ ماہنامہ باجی دہلی۔ سہ ماہی اسباق، پونا، سہ ماہی انتساب۔ سرونج، سہ ماہی کارواں ادب۔ بھوپال۔ سہ ماہی کارواں، ناگپور۔ ماہنامہ رنگ۔ دھنباد۔ ماہنامہ لفظ لفظ انت ناگ کشمیر۔ ماہنامہ نگینہ۔ سری نگر، فنون۔ اورنگ آباد۔ ماہنامہ شیرازہ۔ سری نگر کشمیر، ماہنامہ دنیائے حقیقت۔ دہلی، ماہنامہ گلفام دہلی، ماہنامہ۔ گیسوئے ادب۔ ماہنامہ فکروادب۔ ماہنامہ بیسویں صدی دہلی۔ ماہنامہ مسرت، دہلی۔ ماہنامہ انشا۔ کلکتہ۔ ماہنامہ فروغ ادب، اُڑیسہ۔ سہ ماہی اُردو میلہ۔ ناگپور۔ سہ ماہی تناظر۔ دہلی۔ ماہنامہ سب رس حیدرآباد۔ سہ ماہی سبق اُردو۔ بدھوئی یوپی۔ ماہنامہ ادبی محاذ کٹک۔ ماہنامہ سلسلہ، کٹک۔ ماہنامہ تحریر نو نئی ممبئی۔ ماہنامہ رنگ وبو۔ حیدرآباد۔ ماہنامہ اُمنگ نئی دہلی۔ ماہنامہ بیباک مالیگاوں۔ ماہنامہ قرطاس، ناگپور۔ ماہنامہ گلبن۔ لکھنو۔ ماہنامہ شاخیں بھوپال۔ سہ ماہی تمثیل نو۔ دھنباد (بہار)۔ ماہنامہ۔ آجکل۔ نئی دہلی۔ ماہ نامہ۔ زیور سویڈن۔ ماہ نامہ پرواز۔ لنڈن ماہ نامہ ثمر۔ مراداآباد۔ پروازادب۔ پنجاب۔ خوشبو کا سفر۔ حیدرآباد۔ ماہ نامہ ظرافت۔ بنگلور۔ ماہ نامہ کوہسار۔ بھاگلپور۔ (بہار) ماہنامہ شاندار۔ اعظم گڑھ (یو۔ پی) ماہ نامہ تکمیل۔ بھونڈی (مہاراشٹر) ماہ نامہ زبان و ادب۔ پٹنہ (بہار) ماہنامہ صدا۔ سری نگر کشمیر۔ ماہ نامہ شاداب۔ حیدرآباد۔ ماہ نامہ ایوان اُردو۔ نئی دہلی۔ ماہ نامہ عالمی شمع۔ گلبرگہ (کرناٹک) ماہنامہ گلکدہ۔ بدایوں۔ (یوپی) ماہ نامہ بزم ادب۔ سری نگر کشمیر۔ ماہنامہ تحریر ادب۔ وارانسی (یوپی) ماہنامہ توازن۔ مالیگاوں (مہاراشٹر) ماہ نامہ شہپر۔ دھنباد۔ ماہ

نامہ امکان۔لکھنو۔ماہ نامہ گلشن اطفال۔مالیگاوں۔(مہاراشٹر) ماہنامہ زریں شاعیں۔بنگلور (کرناٹک) ماہ نامہ گل بوٹے۔ممبئی۔ماہ نامہ تریاق۔کرلا۔ممبئی۔ماہنامہ آمد۔سمتی پور (بہار) ماہ نامہ شاداب۔لاہور (پاکستان) ماہنامہ تخلیق۔لاہور (پاکستان)۔پندرہ روزہ زنجیر۔لاہور (پاکستان) سہ ماہی۔بادبان۔کراچی (پاکستان) ماہنامہ مسکراہٹ۔(لاہور) پاکستان۔ماہنامہ فکرنو۔سرگودھا (پاکستان) ماہنامہ نوادر۔لاہور (پاکستان) ماہ نامہ غنیمت۔لاہور (پاکستان) ماہنامہ کسوٹی جدید۔سمتی پور (بہار) ماہ نامہ چہارسو۔راولپنڈی (پاکستان) ماہ نامہ اُفق نو۔شاہ جہاں پور۔روزنامہ راشٹریہ سہارا۔دہلی، سہ ماہی فنون۔لاہور (پاکستان) ماہ نامہ زاویہ۔سویڈن۔ماہ نامہ منشور کراچی (پاکستان) ماہ نامہ شب تاب۔سری نگر (کشمیر) ماہ نامہ ملشار۔بڈگام (کشمیر)۔ماہ نامہ نکھار لاہور (پاکستان) ماہ نامہ اُردو معلیٰ۔لاہور (پاکستان) ماہ نامہ کینواس۔سری نگر کشمیر۔ماہنامہ اُردو اکیڈمی۔سری نگر کشمیر۔سہ ماہی۔عالمی ادب۔نئی دہلی۔

اس بات کو کم وبیش 45 سال ہونے کو آئے ہیں۔ اپنی خواہش اور میری فرمائش پر اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' نے فلیٹیز، لاہور میں بین الاقوامی بیلے ڈانسر پرنسز اینہ سے انٹرویو کیا تھا اور قیوم زاہد نے تصاویر اُتاری تھیں۔ انٹرویو کا آخری سوال صحافیانہ مگر اُس کا جواب بہت دانشورانہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ''مادام آپ کی عُمر اس وقت کیا ہے؟'' رقاصہ نے رتجگوں کے خمار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اُنہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں جب تک ناچتی رہوں گی سولہ سال کی رہوں گی''۔

''پوش مال'' کی آمد کی نوید سُن کر مجھے اُس عالمی حسینہ اور مقامی حُسن پرست اظہر جاوید کا یہ مکالمہ یاد آگیا، گویا فنکار جب تک پیہم سفر میں ہے اُس کی ہمت اور صلاحیت جُوں کی تُوں جواں سال ہے اور وہ ایک کے بعد ایک کارنامہ سرانجام دیتا رہتا ہے۔ ''پوش مال'' دیپک کنول کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ بلکہ اسے گل دستہ کہنا چاہیے، پھولوں کی مالا۔۔۔۔

پھول جب کُلی طور پر کھل جائیں تو انہیں مالا میں پرو دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کوئی افسانہ پھول کی مثال ہُوا کرتا ہے؟۔ اپنے دیپک کنول کے یہاں تو پہلے کبھی ایسا نہیں ہُوا۔ اُن کا دُکھ اور رُخ تو صدا کرب اور بلا کی جانب رہا ہے۔ وہ ہجر اور ہجرت کی کیفیات اور مراحل جا بجا ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اُن کے کردار ہر کہانی میں کچھ ایسا کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ بہر کیف میری اُمید، توقع اور اعتماد کہتا ہے کہ کتاب کا عنوان میرے ادیب دوست نے یونہی نہیں چنا ہوگا۔ وہ جیتا رہے اور ہر میدان جیتتا رہے۔ دیپک جب تک لکھتا رہے گا جواں سال ہی رہے گا۔ ایک رقاصہ کی بات بھلا غلط کیونکر ہوگی۔

طفیل اختر

ایڈیٹر ''مسکراہٹ'' لاہور

۱۰/اپریل ۲۰۱۶ء

JAWAHAR PUBLICATIONS
16/K [illegible]
MAHADA Layout Malvani, Malad west, Mumbai-400095
TEL: 022-28804213, 9322640792